

بڑھتے کا ذوقِ عمیق...

41009

جاننا عزیز



87275

~~87275~~

قیمت ————— تین روپے

ناشر ————— مکتبہ تبصرہ بنی ایک روڈ۔ لاہور

مطبوعہ ————— اردو پریس میمکلوڈ روڈ۔ لاہور

تعداد ————— ایک ہزار



## انتساب

اجنبی اقتدار کے دنوں جب چوہدری افضل حق مرحوم اپنے سرکاری عہدہ سے مستعفی ہو کر جنگِ آزادی میں شریک ہوئے، اور اس جرم کی پاداس میں انہیں پہلی بار جیل خانے جا نا پڑا۔ تو وہاں کے ییل و نہارا انہیں راس نہ آئے۔ اور وہ آپے سے باہر ہوا اٹھے۔

گناہ گاروں سے ان کے نگہ داروں کا برتاؤ، انصاف پسند طبیعت اور دلِ غم خوار کے لئے بغاوت کا بہانہ بن گیا۔

قفس کی تیلیوں میں بھی اگر نسیمِ سحری کے جھونکے سکون کا پیام نہیں لاسکتے، تو بیل تانواں کے لئے واجب ہے کہ تڑپ تڑپ کر اپنی بہان جانِ آفریں کے سپرد کر دے، لیکن کسی ایسی زنجیر کو قبول نہ کرے، چاہے اس کی کڑیاں پھول کی پتیوں سے بنائی اور سنواری گئی ہوں۔ قیدیوں سے حکام جیل کے سلوک کو دیکھ کر افضل حق نے جیل (Manual) کے خلاف احتجاج کیا۔ اور اسی جرم میں انہیں جیل حکام نے کھڑی ہتھ کڑی کی سزا دی۔ یعنی دن بھر چوہدری صاحب کو ہتھ کڑی لگا کر درخت سے باندھ دیا جاتا، اور شام کو اپنی کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا تھا۔ مالِ کار چوہدری صاحب کا دایاں باز بیکار ہو گیا اور وہی وجہ سی کہ مرحوم بائیں ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔ یہ انبالہ جیل کا واقعہ ہے۔



جیل خانوں کی اصلاح کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ اور یہی بیج پرورش  
 پا کر ذرا اونچا ہوا تو جنگال کے ایک نوحوان جتندراناتھ داس نے جو سردار  
 بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں سے ایک تھے، اپنے خون سے اس تصویر  
 کو اور رنگین بنا دیا۔ ان دنوں جیل خانوں میں سیاسی قیدیوں سے عام  
 اخلاقی قیدیوں کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ انگریزی قانون نے آزادی  
 وطن کی پاداش میں جیل جانے والوں کو چورا اور ڈاکوؤں کی صف میں لا  
 کھڑا کیا تھا اور ایک ہی زنجیر تھی جس سے دونوں قسم کے قیدی ایک ہی  
 وقت میں حرکت کرتے تھے، رائج الوقت نظام کے خلاف جتندراناتھ  
 داس نے جیل کے حکام سے احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ سیاسی قیدیوں  
 سے بہتر قیدیوں کا سلوک ہونا چاہئے۔ لیکن قیدی کی آواز جیل خانے  
 کی بلند دیواروں سے ٹکڑا کر رہ گئی۔ آخر جتندراناتھ داس تریسٹھ دن  
 کی بھوک ہڑتال کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور بورسٹل جیل میں  
 اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

چوہدری افضل حق اور جتندراناتھ داس اگر آج اس دنیا میں  
 ہوتے تو میں یہ کتاب ان کے نام انساب کرتا۔

جانبا ز مرزا  
 لاہور

۲۴ مارچ ۱۹۶۱ء



# حرفِ آغاز

مجھ سے بعض دوست سوال کرتے ہیں کہ میں نے کون کون سی جیل دیکھی ہے؟ میں کہتا ہوں یہ پوچھو کہ کون کون سی جیل نہیں دیکھی۔ میں نے زندگی کے بارہ برس ان اونچی دیواروں کے سائے میں گزار دیئے ہیں۔ لیکن یہ اونچی دیواریں میرے مقصد سے اونچی نہیں تھیں۔ وطن عزیز کی آزادی کا سودا مجھے ہر قیمت پر کرنا تھا۔ اگر جان دے کر بھی اس بازار سے گزرنا پڑتا۔ تو یہ سودا گراں نہیں تھا۔

جب پہلی بار میرا گذر اس گلی کے موڑ سے ہوا تو یہاں کی ہر چیز میرے لئے اجنبی تھی۔ یہاں بھی ایک سلطنت تھی۔ راعی اور رعایا کے تعلقات میں یہاں بھی نمایاں تفاوت تھا۔ اس بستی کے قانون کی بنیادیں انسانیت کے لہو سے اٹھائی گئی تھیں۔

یہاں حاکم بھی تھے اور محکوم بھی، دونوں کے دلوں میں انتقام کی بھٹیاں سگ رہی تھیں۔ اس الاؤ میں ایندھن کی ضرورت کو انسان کا گوشت پورا کرتا۔ نیز انسانی چربی کی روشنی سے اندھیری کوٹھڑیاں جگمگا اٹھتی تھیں۔ مگر یہاں کے حاکموں کے دل اس قدر سیاہ ہو چکے تھے کہ وہ اس روشنی سے بھی انسانیت کوئی راہ تلاش نہ کر سکے۔

۱۹۳۶ء میں جب میں پہلے پہل لاہور یورسٹل جیل لایا گیا تو میرا بچپنا



جوانی کی سرحدوں پر کھیل رہا تھا، اور ۱۹۵۳ء میں جب آخری بار مجھے جیل بھیجا گیا تو اس سفر کے نشیب و فراز جوں کے توں دکھائی دیئے۔ ظلم و جور اپنے اسی لباس کی رعنائیوں میں مسکرا رہا تھا۔ پھول کا ہر کانٹا اپنی نوک مرگاں پر شبنم کے آنسو لے کر بہا رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر نہ جانے کتنے پھولوں کا خون رقص کر رہا تھا۔ حالانکہ وقت کا تغیر انقلاب کے اکثر تقاضے پورے کر چکا تھا۔

اجنبی قانون کی دیوار پر نئے زایوں کی نیور کھی جا چکی تھی۔ لیکن جیل خانے کے رسم و رواج میں سرمو فرق نہیں آیا۔ یہاں کا انسان انسانیت سے اسی طرح عاری تھا۔ یہاں کے حاکم اور محکوم دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ جو آگ ۱۹۳۳ء میں قیدی اور افسران جیل کے درمیان بھڑک رہی تھی۔ اُس کے شعلے آج بھی اسی طرح روشن دکھائی دیتے ہیں۔ کاش! یہ نفرت محبت میں تبدیل ہو جائے۔ قیدی اور افسران جیل اپنے اپنے فرائض کو پہچاننے اور سمجھنے لگ جائیں۔

زیر نظر کتاب کے مرتب کرنے کا خیال مجھے سن ترین میں لائل پور جیل میں آیا۔

جرم و سزا کا یہ گوشہ ہمارے عوام اور خواص دونوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ نیکی میں اگر کوئی خامی رہ جائے تو اس کی اصلاح ممکن ہے۔ لیکن جب بُرائی پختہ ہو جائے تو اس کا علاج غیر ممکن ہو جاتا ہے۔



انہیں سوچوں میں رہائی کے بعد زیر نظر کتاب کا مسودہ ہنوز نامکمل تھا۔ تکمیل میں سب سے بڑی دیوار میری انگریزی زبان سے ناآشنائی تھی۔ چنانچہ رادرم منظور احمد بھٹی اور ایسے ہی دوسرے دوستوں کی معاونت سے پنجاب لائبریری سے بعض کتابوں کا جو اس موضوع سے متعلق تھیں، حاصل کیے، اور اس مشکل کام کو آسان کیا۔

اب اس کی اشاعت کا سوال تھا۔ مدیر چٹان، آغا عبدالکریم صاحب شورش نے اس کی ذمہ داری لی۔ لیکن وہ اپنے موافق حالات کے پیش نظر اپنے وعدہ کی وفانہ کر سکے۔ آخر اہمیس <sup>۱۹۴۱ء</sup> کا سٹھ تک مسودہ انہیں کی تاویل میں رہا۔ نہ جانے کس بزرگ کی دعا کارگر ہوئی کہ شورش صاحب نے یہ مسودہ واپس کر دیا۔ اور آج میں اسے عوام کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

## اگر

یہ کتاب <sup>۱۹۲۵ء</sup> تک عوام میں آجاتی، تو اسیران اور حکام دونوں کے لئے مفید ہوتی۔ تاہم میں اب بھی با یوس نہیں ہوں ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے  
آخر میں ان مصنفوں اور اخبار کے ایڈیٹروں کا ممنون ہوں۔



کہ جن کی تصنیفات اور اخبارات نے مشکل ترین موڑوں پر  
میری رہنمائی کی۔

جانناز عَزَّوَجَلَّ





رانا جہاں داد خان  
انسپیکٹر جنرل، جیل خانہ جات، مغربی پاکستان



ک  
ذ  
س



## رانا جہانداد خاں

موجودہ دور میں - کسی محکمہ کے افسر کا نیک ہونا - ایسا ہی ہے - جیسے بہبول کے درخت پر گلاب کا پھول تاہم نیک سیرت اور بصیرت رکھنے والے لوگ ہر محکمہ میں تلاش کئے جا سکتے ہیں -

رانا جہاں داد خاں بھی گنتی کے چند افسروں میں شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے ہمیشہ اپنے محکمہ سے انصاف کیا - اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں جھول نہیں آنے دی - وہ جس وردی میں ہوں اسکا احترام آن کے پیش نظر رہا ہے - جب وہ پولیس افسر تھے - تو پولیس کی روایتی گفتگو آن کی زبان پر کبھی نہیں آئی اس کے باوجود قانون کی دیواریں توڑنے والے آن کے سامنے سر نگوں رہے -

آج رانا جہاں داد خاں مغربی پاکستان میں جیل خانوں کے افسر اعلیٰ ہیں - آن کی نظر دیکھتی ہے - دل محسوس کرتا ہے اور دماغ سوچتا ہے - کہ جرائم کیوں اور کیسے پرورش پا رہے ہیں - آیا امارت جرائم کی معاون ہے - یا غربت آدمی کو مجرم بنا دیتی ہے - یہی دو سوال ہیں جو حل طلب ہیں - اور جیل خانوں کی اندر کی آبادی بھی انہی دو سوالوں کے گرد چکر کاٹ رہی ہے -

رانا جہانداد خاں ایسا دور اندیش افسر ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں مصروف ہے - چنانچہ گذشتہ دنوں سے آن کی یہ تجویز حکومت مغربی پاکستان کے سامنے ہے - کہ

جیل میں اخلاقی قیدیوں سے امتیازی سلوک کیوں کیا جا رہا ہے -



امیر کا لڑکا اگر کوئی جرم کرتا ہے تو اسے جیل میں بہتر کلاس دی جاتی ہے اور اسی جرم کا مرتکب اگر غریب کا لڑکا ہو تو اسے عام قیدیوں کی طرح رکھا جاتا ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں فاطمہ بنت قیس کا ایک مقدمہ پیش ہوا اس پر چوری کا الزام تھا۔ اس مقدمہ کے دوران بہت سی سفارشات حضور تک پہنچیں کہ فاطمہ بنت قیس کو رہا کر دیا جائے۔ یہ عرب کے ایک معزز قبیلہ کی لڑکی ہے۔ اس پر فخر انبیاء نے فرمایا۔

کہ فاطمہ بنت قیس ہی نہیں۔ فاطمہ بنت محمد بھی اگر چوری کرے گی تو اس کے ہاتھ بھی قطع کر دئے جائیں گے۔ نیز فرمایا۔ کہ تم سے پہلی امتوں کی تباہی کا باعث بھی ایسی ہی چیزیں تھیں کہ انہوں نے اپنے امراء کے عیب کی پردہ پوشی کی اور اپنے سے کمزوروں پر تعزیریں قائم کیں۔

اس تجویز کے علاوہ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات رانا جہانداد خان قانون اور جرم کے درمیان جو دیوار حائل ہے اسے پاٹنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اگر قانون نے انسان کو اور انسان نے جرم کو سمجھ لیا تو وقت کا بہت سا راستہ بغیر سفر کے طے ہو جائے گا اور اس کا سہرا رانا جہانداد خان ایسے افسروں کے سر پر ہوگا۔ خدا ان کے نیک ارادوں میں ان کا معاون ہو۔ (آمین)

مصنف



ابتدائے آفرینش سے اگر انسانی گناہوں کا شمار کیا جائے تو آسمان کے ستارے بھی گنتی میں بہت کم نکلیں گے۔ اور آدمی کی فردِ حرم اس قدر طویل ہے کہ پہاڑوں کی بندریاں اور سمندر کی ہرئیاں بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں ان گناہوں میں کچھ تو ایسے ہیں جو افسانہ نہیں اور وہ خواہشات نفسانی کے تحت سرزد ہوتے ہیں۔ انہیں عقل سلیم بھی خواہ جنون کے قریب ہو چکی ہو تسلیم کریگی کہ یہ گناہ ہے

سلطنتِ وقت نے انسان کی بعض ایسی حرکات کو بھی گناہ قرار دیا ہے۔ جسے انسان کا اپنا خمیر وقت کی آواز کہہ کر اپنے کو مطمئن کرتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ وہ گناہ نہیں ہوتا۔ لیکن حکمران لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ گناہ ہے لہذا وہ گناہ ہے اور اس گناہ کے مجرم عام انسان ہی نہیں ٹھہرائے گئے بلکہ



پیغمبر بھی اس جرم کے کھڑے میں

پا بدستے دگرے

دست بدستے دگرے

لاٹے اور کھڑے کئے گئے۔ چنانچہ نمرود کی آگ مصر کا جیل خانہ اور صلیب کا نشان میدان کربلا کی طرح آج بھی زندہ جاوید ہیں! دریاٹے نیل کے ہزاروں طوفان فرعون کی لاش ہنوز اپنی آغوش میں لئے بیٹھے ہیں تاکہ دنیا قوم موسیٰ کے عروج و زوال کی داستان دیکھ اور سن سکے۔

یہ ایسے لوگوں کی کہانی ہے جن کی پشت پناہی ہمیشہ قلم اور تلوار نے کی۔ اور وہ ایسے مقام پر اکھڑے ہوئے جہاں نیکی بدی سے الگ اپنا راستہ تجویز کرتی ہے اور انسان انسانی طاقت کے بلند مینار پر کھڑا ہو کر آدمی کو آدمیت سے دور دیکھتا ہے۔ وقت کے عارضی اور شخصی وقار کا سہارا لے کر زندگی کے لئے ایک سنگھاسن تجویز کرتا ہے اور اسے دائمی سمجھتا ہے لیکن جیسے ہی قلم اور تلوار اس کی اپنی موت پر دستخط کرتے ہیں تو اسے اپنے گناہوں کی قلم چلتی دکھائی دیتی ہے مگر اس کا احساس ہوتے تک زندگی موت کے دروازے پر دستک دے چکی ہوتی ہے مسافر منزل کی حد سے گذر چکا ہوتا ہے جیون بینا کے تمام تار ٹوٹ کر گر چکے ہوتے ہیں! اس کی لے نہ تو اب تیرہ گایا جاسکتا ہے نہ فریاد کے لئے کوئی سہرا ساتھ دے سکتی ہے۔



اس کا رگاہ عالم میں انسان کی حیثیت آسمان کے بے ربط ستاروں کی طرح ہے۔ وہ چلتا ہے تو صراطِ مستقیم چھوڑ کر۔ بیٹھتا ہے تو اٹھنے کے لئے بے قرار نظر آتا ہے۔ ہنسنے کا سامان قدرت کرتی ہے تو رونے کے بہانے وہ خود تلاش کر لیتا ہے۔ اگر دل کسی راز کو راز بنانا چاہتا ہے تو نگاہوں کے آنسو اس کی پردہ درسی کرتے ہیں! زبان اور دل کے ہم آہنگ ہونے میں بڑا راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اگر ان میں ہم آہنگی ہو تو فیصلے میں غلطی نہیں ہو سکتی اسی طرح اگر انسانی وجود کے تمام اعضاء ہم نوا ہوں تو فطرت کے خلاف بغاوت کا امکان ہی نہیں ورنہ ہمیں سے گتہ کی ابتدا ہوتی ہے۔

پس پھر کیا ہے انسان عجیب عجیب حرکات کا مرکب ہوتا ہے جنوں شوق کی کتنی راہیں ایسی ہیں جن پر چلتے وقت یہ خود کو کوسوں دور چھوڑ جاتا ہے پھر اس پگڈنڈی پر کس قدر کانٹے ہیں! جن سے اس کا دامن نہیں اُلجھتا۔

کہیں اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے بتوں کو خدا کا وسیلہ خیال کرتا ہے کہیں چاند اور سورج کی چمک اس کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور یہ جبینِ نیاز خم کر دیتا ہے کہیں درخت کی گھنی چھاؤں اور بہتے پانی کے تیز دھارے کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ قوتِ حکومت کا موسمی اقتدار تو انسانی زندگی کا اکثر ملجا اور ماوا رہا ہے۔

انسان جیبِ ضد پر آمادہ ہو تو خالق کو مخلوق کا درجہ دینے میں دیر نہیں لگتی ہونہ ہو شاید یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا دل اور دماغ سوچنے میں ہم آہنگ



نہیں ہوتے اور اس گناہ کی وادی میں قدم بھی انسان کا ساتھ دیتے ہیں ضرورت پڑے تو ہاتھ بھی اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ نگاہوں سے جیاء رخصت ہو جاتی ہے ضمیر مردہ ہو چکا ہوتا ہے قوت ہاضمہ رزق حرام کے ہضم کرنے میں معاون ہوتی ہے اور یہی انسانی گناہوں کی معراج ہے۔

اس پھسلتی زمین پر گناہ اپنے شکار کے لئے سینکڑوں روپ دھارتا ہے۔ معصیت پسند انسان مختلف کمین گاہوں سے ہوتا ہوا آخر اس میں الجھ جاتا ہے وقت کی رفتار کے ساتھ جیسے وہ آگے بڑھتا ہے زلیست کی تمام راہیں اسے برائی کی سنگ میل دکھائی دیتی ہیں یہ وہ راستہ ہے جہاں صرف دکھائی دیتا ہے سناٹی نہیں دیتا۔ اس راستے کے ایک ایک موڑ پر گناہ ہمہ اقسام کے لبادے لے کھڑا رہتا ہے ان میں شخصی وقار اور شہنشاہی کا لباس سب سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے اس کی تاب و توانائی سے عقل و خرد کے تمام چراغ روشن ہونے لگتے ہیں یہی روشنی ہے جو انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔

پھر انسان انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے جرم و سزا کی یہ تاریخ اس قدر بوسیدہ ہو چکی ہے کہ مستقبل کا مورخ اس میں اپنے لئے کوئی جاؤ بیت نہیں پاتا۔

انسان اور گناہ ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں پیغمبر کے علاوہ فطرت انسانی پہر طور اسی بانسار کی جنس ہے طلوع و غروب کے درمیانی عرصہ



میں یہ سوداگئی باریجیا اور خریداجاتا ہے۔

زندگی کے چوبارے سے لے کر شہنشاہ کے تخت تک گناہ کی سینکڑوں ہی  
سیرھیاں ہیں جنہیں آدمی، آدمیت سے الگ ہو کر صرف گناہ کے سہارے عبور کرتا  
ہے۔ انسان دنیاوی طور پر جتنے بلند مقام پر ہو گناہ کا درجہ اسی قدر اونچا اور بلند

ہوتا ہے۔

زمانہ جس قدر منسزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔ ماضی کے نقوش اسی تیزی کے ساتھ  
ابھرتے اور نکھرتے جا رہے ہیں۔ پتھروں کی سلوں سے اتر کر نقش ماضی تاریخ کے دامن  
سے بندھ چکے ہیں کہ انسان جب برسرِ اقتدار آیا تو اس نے انسان اور انسانیت سے  
کیا برتاؤ کیا۔

رومن سلطنت میں :-

انسانی گناہ اپنے شباب پر تھا چنانچہ حیوانوں سے بد فعلی کا عام رواج  
تھا اور لوگ جس جانور کے ساتھ بد فعلی کرتا پسند کرتے اسی کے نام  
کے ساتھ اپنا نام منسوب کرتے مثلاً ایک آدمی بکری کو پسند کرتا —  
وہ "گیراوی" (بکروئی) اور جو بطنخ کو پسند کرتا وہ "افراوی" (بطخی)  
کہلاتا تھا۔ کتوں اور بندریوں کے دلدادہ "بلواری" کہلاتے تھے۔

مسیحیت کے ابتدائی دور میں :-

بعض لمحد فرقوں میں حیوانات کے ساتھ بد فعلی اور انعام بازی کو اچھا



سمجھا جاتا تھا۔

نمرود کے عہد میں :-

محفص مٹی کے بت توڑنے کے الزام میں انسان کو زندہ آگ میں جلا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اور جو لوگ اپنے مذہب سے منحرف ہو جاتے ان کے ہاتھ اور پاؤں میں لوہے کی مینجیں ٹھونک دی جاتی تھیں۔

برہمن کے عہد میں :-

انسان نے جب برہمن کا روپ دھارن کیا تو اپنے علاوہ عام انسانوں کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ۱۔ کھشتری، ۲۔ ویش، ۳۔ شودر۔ آخر الذکر کو اس قدر ذلیل سمجھا گیا کہ اونچی ذات کے کسی آدمی کو گالی دینے پر اس کی زبان کاٹ لی جاتی تھی۔ برابر بیٹھے پر جسم میں گہرا گھاؤ کر دیا جاتا۔ اگر مذہبی امور میں وہ کسی برہمن کو مشورہ دیتا تو اس کے منہ اور کان میں گرم تیل ڈال دیا جاتا۔ برہمن کی چوری کرنے پر شودر کو موت کی سزا ملتی۔ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ سلوک کا یہ عالم تھا کہ ذرا سی مذہبی غلطی پر آگ میں جلا دیا جاتا پرانی عورت سے اختلاط کی بنا پر کتوں سے پھڑوا دیا جاتا یا لوہے کے پلنگ پر آگ سے



تیا کر جلا دیا جاتا۔

چندر گپتا کے عہد میں :-

محض جنگی کا محصول نہ دینے پر پھانسی دے دی جاتی تھی۔

شاہجہان کے عہد میں :-

حضرت شاہ ولی اللہ کے ہاتھوں کے پہنچے محض اس لئے اتر وادیٹے

کہ انہوں نے حجت البالغہ کتاب کیوں تصنیف کی۔

فرخ سیر کے عہد میں :-

سیاسی اور مذہبی اختلاف کی بنا پر بندہ بیراگی اور اس کے ساتھیوں کو تاش کا جامہ پہنا کر لوہے کے پنجرے میں بند کیا گیا۔ اور اس کے تمام جسم کو گرم سلاخوں سے داغا گیا اس کے سامنے اس کے معصوم بچے اس کی بلی تک کو قتل کیا گیا۔

حیدر علی کے عہد میں :-

کھنڈے راؤ کی مرٹوں سے سازش کی بنا پر حیدر علی کو بنگلور چھوڑ کر بھاگنا پڑا واپسی پر فاتح حیدر علی نے مفتوح کھنڈے راؤ کو اسکی رانی کے مشورہ پر لوہے کے ایک پنجرہ میں مدتوں طوطا بنا کر رکھا۔

انگریزوں کے عہد (۱۸۵۷ء) میں :-

آزادی مانگنے کے جرم میں مسلمان قیدیوں کے جسم کو گرم لوہے اور



تانبے سے داغا گیا۔ انہیں زندہ سوڑ کی کھالوں میں سی سی کر آگ  
میں جلایا گیا۔ توپ سے باندھ کر اڑانے کا سلسلہ تو عام تھا۔

تاریخ انسانی کے دامن میں ایسے ہولناک واقعات کی کمی نہیں لیکن دودرواں  
کے پاس وقت کی کمی ضرور ہے زمانہ جس تیز روی کے ساتھ مستقبل کا راستہ طے  
کر رہا ہے اس کے ہاں ماضی بعید کی کہانی سننے کا وقت کہاں ہے بنا برین واقعات  
کو زیادہ طوالت نہیں دی گئی ورنہ کائنات کے ایک ایک ذرے سے انسانی  
معصیت کی بواہر ہی ہے اور اس تعفن سے فرشتوں کے پر جلنے لگے ہیں اور ڈر  
ہے کہ اس جلن سے پھڑپھڑا کر فرشتے نیز ان کے حضور میں پھر سے نہ کہہ اٹھیں:

قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ

فِيهَا وَيَسْفِكُ الدَّمَاءَ وَنَحْنُ

نُسَبِحُ بِحَمْدِكَ وَ

نَقِدُّ سُلُوكَكَ

— ❦ —



## جیل

یہ لفظ انگریزی زبان کا ہے اور عربی میں یہی لفظ جن کہلاتا ہے فارسی میں اسے زندان کہتے ہیں اور اردو میں قید خانہ۔

جس قدر ان الفاظ کی عمر ہے۔ اسی قدر یہ عمارت بھی پرانی ہو چکی ہے۔ اگرچہ تاریخ اس پرمنوں مٹی کا بوجھ ڈال چکی ہے اور اس کے رنگ و روغن میں مختلف صدیوں میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تاہم ہر آنے والے شخص اور اجتماعی قانون نے اسے اپنے طور طریقوں سے ابھارنے کی کوشش کی تا آنکہ برصغیر پرانی یہ عمارت ہنوز اپنے انوکھے پن سے انسانیت کے دامن پر ایک داغ بن کر چمک رہی ہے۔

تاریخ کے الٹ پھیرے پتہ چلتا ہے کہ جیل خانہ کی عمارت بھی زمانہ کے



ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بدلتی رہی ہے۔ چنانچہ ابتدا میں مجرم کو پہاڑ کی غاروں اور زمین دوز عمارت میں قید کیا جاتا تھا۔ زمانہ اور آگے بڑھا تو گھر کی چار دیواری مجرم کے لئے تجویز کی گئی۔ جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حکومت مصر کے خاصہ داروں کے گھر میں رکھا گیا۔ اور اس کے انتظام کے لئے ایک داروغہ مقرر تھا۔ فرعون مصر کا باورچی اور ساتھی بھی بطور مجرم یہیں قید تھے۔ بنی اسرائیل کے عہد میں جیل خانہ بادشاہ وقت کے محل کے عین مقابل ایک صحن دار چھانگ والی عمارت کی صورت میں ہوتا تھا۔ اور ان سے چکی سپوانے کی مشقت لی جاتی تھی۔ باغی قیدی کو بیدار کرنے کی سزا کا رواج بھی بنی اسرائیل کے عہد کی یادگار ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی ایسی ہی سزاؤں کا رواج تھا۔ بلکہ جیل میں داخل ہوتے وقت مجرم کو کاٹھن مار دیا جاتا تھا یعنی مجرم کے پاؤں میں لکڑی کی بھاری بیٹری کی قسم کی ایک چیز ڈال دی جاتی تھی۔ اور اسے مقفل کر دیا جاتا تھا۔ اس سے مجرم ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ بنی اسرائیل اور عیسائیت کے عہد میں مجرموں سے ایسا ہی سلوک رواج رکھا جاتا تھا۔ آفتاب رسالت سے پہلے تمام عرب گناہوں کے اندھیرے میں گھرا ہوا تھا۔ انسانیت سرپیٹ کر رہ گئی تھی۔ قانون اور مجرم ایک دوسرے سے بے لگاتار کر رہے تھے۔ اس فضا میں فاران کی چوٹی سے اللہ کا پیام ایک قانون لیکر اترتا اور اس نئے قانون الہی کے مجرموں کو جو سزائیں دیں۔ وہ ماقبل تاریخ سے



نئی اور انوکھی تھیں۔ حضور قیدیوں کو اپنے صحابہ کے گھروں میں تقسیم کر دیتے تھے اور انہیں پیٹ بھر کر کھانا دیا جاتا تھا۔ شرارتی قسم کے قیدیوں کی مشکیں باندھ دی جاتی تھیں۔ چنانچہ عباس بن عبدالمطلب ایک قیدی ہیں۔ جو بدر کے قیدیوں میں سے تھے۔ انہیں حضور سرور کائنات کے دولت کدہ پر مشکیں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ بعض قیدیوں کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔

خلافتِ فاروقی تک عرب میں جیل خانوں کا بظاہر کوئی انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے مکہ معظمہ میں صفوان بن امیہ کا مکان چار ہزار درہم پر خرید کر جیل خانے کی بنیاد ڈالی۔ پھر تمام اصناع میں اسی قسم کے عام جیل خانے بنوائے گئے۔ شروع میں یہ عمارت بعض جگہوں پر گھاس پھوس اور بانسوں سے تعمیر کی گئیں۔ سلسلہ ہجری کے اواخر میں عمارت پختہ بنا شروع ہو گئی تھیں۔ پختہ جیل خانوں کے علاوہ حضرت عمرؓ نے تہ خانہ بھی قیدیوں کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ اس زمانہ کا مشہور شاعر جو بن جویس کمال رکھتا تھا، ایک تہ خانہ میں قید کیا گیا۔ اگر کوئی مالدار اپنے کسی گناہ کی وجہ سے قید کیا جاتا تھا، تو اسے اپنے دل سے اپنی خوراک کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ ورنہ عام قیدیوں کے لئے خوراک بیت المال سے جاتی تھی۔

مہی حال ہندوستان کا تھا۔ یہاں کے راجاؤں اور مہاراجاؤں نے قیدیوں کے لئے یا تو قلعے استعمال کئے۔ یا پھر سپاہیوں کے غاروں سے کام لیا۔ چنانچہ



مٹھرا کے راجہ کنس نے کرشن کے والدین کو اس خوف سے کہ ان کا لڑکا میری  
 موت کا باعث ہو گا اپنے قلعے کے برابر ایک بڑے سے مکان میں ہتھکڑیاں اور  
 بیڑیاں ڈال کر باہر سے تالہ ڈال دیا تھا۔ اور وہ اس جگہ پر بارہ برس تک قید  
 رہے۔ اسی طرح راجہ ہر سندھ نے اپنے سیاسی حریفوں کو پہاڑ کی کھوہ میں ایک  
 گڑھا کھود کر اس میں بند کر دیا تھا۔ اور اس کے دروازے پر ایک بھاری پتھر  
 رکھ دیا گیا تھا۔ راجہ تندولیو (جو قبل از مسیح گذر چکے ہیں) نے اپنے وزیر اعظم  
 اشک ٹار کو مع اس کے خاندان کے اندھے کوئٹہ میں قید کیا تھا۔ اور تمام خاندان  
 کو سواد و سیرستو بطور خوراک دیئے جاتے تھے۔

علاؤ الدین خلجی کے عہد میں گوالیار کا قلعہ عام قیدیوں کے لئے استعمال  
 ہوتا تھا۔ اور جھانسی کا قلعہ کچھ مدت مجرموں کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ جلال  
 الدین کے دونوں بیٹوں کو اس کے کوٹوال نصرت خان نے جھانسی کے قلعہ  
 میں قید رکھا۔ محمد شاہ تغلق کے دور حکومت میں بڑے بڑے مجرموں کے لئے قلعوں  
 کے اندر ایسے ایسے خوفناک گڑھے تعمیر کئے جاتے تھے۔ جن میں چوہے پرورش  
 کئے جاتے۔ اور ان چوہوں سے بلیاں بھی خوف کھاتیں۔ یہ چوہے رات بھر  
 قیدیوں کو پریشان کرتے۔

سطور بالا سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف حکمران اپنے سیاسی  
 اور غیر سیاسی مجرموں کو قلعوں اور پہاڑوں کے غاروں میں قید کر کے انہیں سزا



دیتے تھے۔ مگر جیل خانوں کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔

محمد شاہ تعلق کے ہم عصر سلطان جلال الدین کی بیٹی سلطانہ خدیجہ نے جزیرہ مالدیپ میں لکڑی کے گھروں میں قیدیوں کو رکھنا شروع کیا۔ یہ گھر عام طور پر سوداگروں کے مال و اسباب کے لئے بھی استعمال ہوتے تھے۔

مرہٹوں کے نظام سلطنت ۱۷۳۸ء سے ۱۸۵۲ء تک مجرموں کو مولشی باڑا میں رکھا جاتا تھا۔ اسی زمانہ میں چور اور ڈاکوؤں کا سامان ضبط کر لیا جاتا اور انہیں بیڑیاں ڈال کر مولشی خانہ میں قید کر دیا جاتا۔ دیگر جرائم کے مجرموں کے ہاتھ اور انگلیاں کاٹ لینے کا بھی رواج تھا۔ سیاسی لحاظ سے یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی غلامی کی ابتدا ہوئی۔ پھر جہاں جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بڑھا۔ وہیں جیل خانے کی تعمیر شروع ہوئی۔ لیکن عام طور پر انگریزی حکمرانوں نے بھی قلعوں کو بطور جیل استعمال کیا۔ چنانچہ ۱۸۰۱ء میں شاہ اودھ کو کلکتہ کے قلعہ میں ۱۸۰۶ء میں خاندان ٹیپو کو بلا کر قلعہ میں ۱۸۲۸ء میں رانی جند کو چنار کے قلعہ میں نواب واجد علی شاہ کو ۱۸۵۶ء میں فورٹ ولیم میں قید رکھا گیا۔ ایشیائی ممالک کی اس تاریخ کے علاوہ یورپ اپنے تمدن کے باوجود جرم و سزا کے کٹہرے میں اسی طرح پایہ سلاسل ہے۔ جس طرح دوسرے ملک۔

مسٹر جان ہاورڈ (John Howard) ۱۸۱۰ء صدی کے  
آواخر میں جیل خانوں کے حالات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔



قیدخانہ ایک ایسی تنگ و تاریک کوٹھڑی ہوتا تھا جس میں آدمیوں کی بھرمار گندگی اور بدبو کے ساتھ ہوا کا نام و نشان نہ ہوتا تھا قیدیوں کی غذا کا انحصار جیلر کی مرضی پر ہوتا تھا۔

پانی انتہائی قلیل تعداد میں دیا جاتا۔ گھاس پھونس کا بستر ہوتا تھا پاؤں میں بھاری بھرم بیڑیاں پہنائی جاتیں۔ تمام قیدی جیلر کے غصے کے برابر کے شکار ہوتے تھے۔

جیل میں قید رکھنے کی بجائے جلاوطنی کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔

اُس زمانہ میں مسٹر جان ہاورڈ (John Howard) نے بہت سی تجاویز جیل خانوں کی اصلاح کے لئے پیش کیں۔ اس کی تائید مسٹر جرمی بنتھم (Jeremy Bentham) نے کی جو ان دنوں پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ تجویز یہ تھی کہ قیدخانہ ایک گول احاطہ کی شکل میں لوہے کے جھنگے کی صورت میں ہو جس کے بیرونی محیط پر کوٹھڑیاں ہوں۔ نیز یہ کہ ہر قیدی کو کڑی نگرانی میں رکھا جائے، اور کچھ نہ کچھ کام لیا جائے۔

آخر ۱۸۱۳ء میں (Mill Bank) مل بنک قیدخانے کی تعمیر شروع ہوئی جس کی ۱۸۱۶ء میں ترقوی طور پر تکمیل ہوئی۔ اور یہ تجویز وضع ہوئی کہ تنہائی کام پر لگانے اور مذہبی تعلیم سے قید خانوں کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔

جیل ایک عجیب شان سے شروع کیا گیا۔ اس کی تعمیر پر تقریباً نصف کروڑ

~~87275~~  
87275



روپیہ خرچ کیا گیا۔

لندن میں اس قید خانے کے تھوڑے فاصلہ پر شہر کا بڑا قید خانہ نیو گیٹ (NEW GATE) ٹریناک حالت میں تھا۔ چنانچہ ۱۸۱۲ء میں اس کو از سر نو منظر عام پر لانے کے لئے ہر ممکن ذرائع استعمال کئے گئے۔

۱۸۱۶ء میں مس فرائی (MISS FRY) نے نہ ناناہ قیدیوں کی حالت کو دیکھا۔ ان کی اصلاحات کے لئے اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جس جیل خانہ میں گئیں۔ قیدیوں کو جنگلی جانوروں کی طرح گالی گلوچ دھول دھپا اور بد اخلاقی میں مصروف پایا۔ اور اس نے ان حالات کے پیش نظر جیل خانوں کو دنیا میں دوزخ کا نام دیا۔ ایک مہینہ کی مختصر جدوجہد کے بعد وہ صرف ایک جیل خانہ کو سکون اور خاموشی میں تبدیل کرا سکی۔ انہیں جنگلی جانوروں کی طرح سدھایا گیا۔ اسی قسم کی اصلاحات انگلستان کے دوسرے قید خانوں میں بھی کی گئیں۔

مس فرائی (MISS FRY) کی کامیابی سے متاثر ہو کر پرنس ڈسپلن سوسائٹی (PRISON DISCIPLINE SOCIETY) نے اپنا کام شروع کیا اور جیلوں میں غیر انسانی سلوک کے خلاف احتجاج کیا۔ اور جیلوں کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ بنانے کی تجویزیں کی گئیں۔ اس وقت کی حکومت نے سوسائٹی ہڈ کے اس اقدام کو قیدیوں کے حق میں زہر قابل اور جرائم میں اعتراف کا باعث خیال کیا لیکن سوسائٹی اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ اور بعض اصلاحات کو ایک مسلمہ قانون



میں گئیں جہاں زنانہ قیدیوں کی انچارج عورت ہونی چاہئے۔ مردوں کو عورتوں سے علیحدہ رکھا جائے۔ اور انہیں کسی نہ کسی کام پر لگانا جائے وغیرہ وغیرہ۔ کافی عرصہ تک ان اصولوں کو اگرچہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن ۱۸۲۳ء، ۱۸۲۷ء کے قوانین میں بہر حال انہیں مان لیا گیا۔ نیز یہ بھی تسلیم کیا گیا۔ کہ قید خانوں میں صحت کی برقراری، کردار کی اصلاح اور سخت محنت کی عادت انتہائی ضروری ہے۔ ہتھکڑیاں لگانا اور بیڑیاں پہنانا سختی سے منع کر دیا گیا۔ اور فیصلہ کیا گیا۔ کہ ہر قیدی کا ایک بستر ہو اور اسے علیحدہ کوٹھڑی میں رکھا جائے۔

۱۸۳۱ء میں دارالعوام (لنڈن) کی طرف سے ایک کمیٹی منتخب کی گئی۔ جس نے اس معاملہ کی تحقیقات کی اور کچھ مشکلات پیش کیں۔ جو موثر اقدامات کے راستے میں حائل تھیں۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ تمام قید خانوں کو یکسر بدل دیا جائے اور ہر قیدی کے لئے علیحدہ علیحدہ کوٹھڑی تعمیر کی جائے۔ اس کمیٹی کے اکثر افراد ریاست ہائے متحدہ کے عظیم الشان قید خانوں سے متاثر ہوئے تھے۔

۱۸۳۵ء میں پھر سے دارالامراؤں (HOUSE OF LORDS) کی منتخب کمیٹی نے یہ کلام اپنے ذمہ لیا اور طویل تحقیق کے بعد مردوں کو عورتوں سے علیحدہ رکھنے کے اصول کو تسلیم کیا۔ نیز اس بات پر زور دیا کہ کام اور تعلیم وغیرہ کے سلسلہ میں سب قیدیوں سے یکساں سلوک کیا جائے۔ اور ایسے افراد مقرر کئے۔



جو جائزہ لیں کہ کمیٹی کے ان قوانین پر عمل ہو رہا ہے کہ نہیں۔  
انگلستان کی طرح جہاں کہ پچاس برس قید ایک دوسرے درجہ کی سزا رہی ہے۔  
امریکہ نے بھی اپنے ہاں کے جیل خانوں کو نئے سرے سے درست کرنے اور ان کی  
اصلاح کے لئے قدم اٹھایا۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے آخر میں مسٹر کیو کراف پنے  
لیوانیا (Quaker of Pennsylvania) نے اپنا فرض خیال کیا کہ قیدی کی زندگی  
کو سدھارا جائے۔ اس سلسلہ میں پہلی کڑی وال نٹ (Walnut) سٹریٹ  
کے حالات درست کرنا تھا یہ جیل خانہ امریکہ کے بڑے جیل خانوں میں سے  
نہیں تھا تاہم اس کی اصلاح کے نتائج سے یہ بات تسلیم کر لی گئی۔ کہ قید تنہائی کوئی  
اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکی۔ امریکہ کی دوسری کئی ریاستوں نے پنے لیوانیا کی  
مثال پر عمل کیا ۱۸۴۷ء میں نیویارک میں ایک نیا قید خانہ آبرن (Auburn) بنایا گیا۔  
کرافورڈ (Crawford) جو قید تنہائی کے حق میں تھا۔ یہ بات تسلیم کئے  
بغیر نہ رہ سکا۔ کہ قید تنہائی خودکشی کی واردات کو جنم دیتی ہے۔ اس کے بعد  
(سی) سنگ سنگ کے قید خانہ میں ایک نیا سسٹم رائج کیا گیا جس کے  
مطابق کھانے کے اوقات میں اور رات کے وقت قیدیوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جاتا۔  
لیکن کام کے وقت سب اکٹھے رہتے تمام قیدیوں کو حکم دیا گیا۔ کہ وہ کام پر خاموش  
اور سکون کے ساتھ رہیں۔ اس طریق کار پر عمل کرتے ہوئے حکام جیل نے بہت ظلم  
روا رکھا۔ مسٹر کرافورڈ نے قید خانوں کے مندرجہ نظاموں کے فوائد اور



نقصانات گنوا کر " پیسے یونانیا " کے مشرقی قید خانوں میں راج طر لقیوں کو سراہا۔  
 کرا فورڈ ریاست ہائے متحدہ سے واپس آیا تو تجویز کیا کہ ہر قیدی کو علیحدہ علیحدہ کوٹھڑی  
 میں سلایا جائے۔ حکومت نے کرا فورڈ کے نظریات کی تعریف کی اور جہاں جہاں ممکن  
 ہو سکا اس پر فوری عمل کیا۔

مل بنک میں قید تنہائی پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا چنانچہ ۱۸۳۳ء میں " لارڈ  
 جان رسل " نے یہ رائے ظاہر کی کہ قیدیوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا ضروری ہے آخر  
 ۱۸۳۹ء میں قانون پاس کیا گیا۔ کہ تمام قیدیوں کو الگ الگ کوٹھڑی میں رکھا  
 جائے۔ اس آئین کی رو سے ۱۹۲۴ء میں پنٹو ویلا (PENTO VILLA) نامی قید خانہ  
 کی تعمیر شروع کی گئی جس میں ۵۲۰ علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیاں تھیں۔

چھ سال کے قلیل عرصہ میں امریکہ کے علاوہ بلجیم اور فرانس میں بھی اسی قسم  
 کے جیل خانے تعمیر کئے گئے۔

۱۸۹۹ء کے پہلے ہینے میں قیدیوں کو اکٹھا رکھنے کا طریقہ رائج کیا گیا۔ اور  
 ۱۹۱۰ء میں ہوم سیکرٹری نے بہت سے قوانین منسوخ کئے جو قیدیوں کی اصلاح میں  
 حائل تھے۔

مسٹر جارج گرے نے تین اصول وضع کئے جن کی رو سے گھر بلو قید اور  
 کردار کی بلندی پر کسی عوامی قید خانے یا گھر کی چار دیواری کے اندر اور باہر سخت  
 مشقت اور تیسرے قانون کی رو سے قیدی کو باہر کی نو آبادی میں جلا وطن کر



دینے کی سفارش کی گئی۔

پنیوویلا۔ مل بنک۔ ویلفیلڈ اور لیسٹر کے قید خانوں میں ان تجاویز پر عمل کیا گیا۔ لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی ۱۸۴۵ء پو لینڈ میں ایک نئے قید خانہ کی سفارش کی گئی جس کی تعمیر ۱۸۴۶ء میں شروع ہوئی۔

( ڈارٹ مور میں پہلے سے ایک قید خانہ موجود تھا جس میں دس ہزار کے قریب فرانسیسی اور امریکن قیدی موجود تھے۔ تھوڑی سی اصلاح کے بعد یہ جیل خانہ ایک اچھا جیل خانہ بن گیا۔ جارج گرے کی تیسری سکیم اگرچہ بہتر تھی۔ لیکن کوئی نوآبادی ایسی نہ تھی جو مجرموں کو بطور قیدی کے قبول کرتی۔ اور "وین ڈامن لینڈ" نے تو صاف انکار کر دیا۔ کہ وہ اپنے ملک کی کسی بندرگاہ پر ایسے ملزموں کے جہاز ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیگا۔

۱۸۵۳ء میں پہلا پنیل سرویٹو ایکٹ (PENNEL SERVITUTE Act) بنایا گیا جس کی رو سے سزاؤں میں تخفیف کر دی گئی لیکن اس کا بھی کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ اور جرائم بڑھتے رہے۔

۱۸۶۲ء میں دارالعلوم نے ایک اور کمیٹی منتخب کی اس زمانہ میں تمام قید خانوں میں قیدیوں سے ایک سا سلوک نہیں ہوتا تھا۔ کہیں کافی خوراک دی جاتی کہیں بھوکوں مارا جاتا۔ بعض جگہ کوٹھڑیاں تنگ و تاریک ہوتیں اور بعض



جگہ کشادہ۔ قید تنہائی کی مدت ۸ ماہ سے گھٹا کر ۹ ماہ کر دی گئی۔ ان حالات میں مسٹر چارلس پٹرین ایم۔ پی نے ایک ایسی کمیٹی بنانے کی تحریک کی۔ جو جیل خانوں میں یکساں سلوک کے متعلق غور کر سکے۔ ۱۳ برس گزار جانے کے بعد بھی اس تحریک پر کوئی عملی اقدام نہ کیا گیا۔ آخر ۱۸۷۳ء میں ایک کمیٹی بھیجی۔ جس نے رپورٹ پیش کی کہ خوراک محنت اور عام ڈسپین کے لحاظ سے جیل خانوں میں ایک نمایاں فرق پایا جاتا ہے جس کے نتائج غیر یقینی اور سزاؤں کی بے اثری ہوتی ہے۔

۱۸۷۵ء میں پریزن بل (PRISON BILL) بنایا گیا۔ جس کی رو سے تمام جیل خانوں کا انتظام کمشنروں کے سپرد کیا گیا۔ اور آج بھی یہی قانون رائج ہے ۱۸۷۶ء ۱۸۷۶ء کے درمیان بدترین مجرموں کی سزاؤں میں کمی کی گئی اور مشقت کے وقت بالوں کی ممانعت کر دی گئی۔ ۱۸۸۰ء میں اسی قانون کی ایک اور شق وضع کی گئی جس کے مطابق نئے ملازموں کو پرانے ملازموں سے علیحدہ رکھنے کی تجویز کی گئی اور پولیس کی حوالات میں رکھنے کے بعد ملازم کو جیل خانہ میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں وہ اپنے مقدمہ کے فیصلے کا انتظار کرتا۔

لندن میں عام رواج تھا۔ کہ کسی ملازم کو تین ماہ سے زیادہ حوالات میں نہیں رہنا پڑتا تھا۔ آگے چل کر یہ مدت ایک ماہ تک رہ گئی۔ دورانِ مقدمہ ملازم اپنے کپڑے پہن سکتا، اپنا کھانا کھا سکتا ہے اپنے



دوستوں اور وکلا سے مل سکتا ہے۔

ہر قیدی کو ایک ماہ تک علیحدہ رکھا جاتا ہے پہلے پہینے وہ لکڑی کے بستر پر  
سوتا۔ جب اچھے نمبر حاصل کرتا اس کی خوراک بہتر ہو جاتی۔ تیسرے اور چوتھے  
دور میں اسے دوستوں سے ملنے کی مراعات حاصل ہو جاتیں۔ خطوط کی عام  
اجازت ہوتی۔

ساتھ سال کے بوڑھوں اور سولہ سال سے کم عمر بچوں کو اچھے بستر پر  
سونے کی اجازت ہوتی۔

مزم دوسرے اور تیسرے دور میں، اسٹنگ تک لگا بھی سکتا تھا۔  
مشقت — دزدی کا کام۔ جوتے بنانا۔ ٹوکریاں بنانا۔ جلد بندی۔ پرنٹنگ  
اور دیگر دستکاریوں پر مبنی ہوتی ہے۔ ہر قیدی کو مذہبی معلومات دی جاتی۔  
اور اس کی جسمانی صحت کا خیال رکھا جاتا۔ صفائی کا سختی سے حکم دیا جاتا۔  
خوراک ہر جگہ ایک سی ہوتی۔

جب سزا کی مدت دو سال سے بڑھ جائے۔ تو مجرم کو عادی مجرموں کے  
جیل خانہ میں ڈال دیا جاتا۔ اس کے تین درجے ہوتے۔ قید تنہائی۔ مشقت  
اور مشروط رہائی۔ پہلا دور جو چھ ماہ کی مدت کا ہوتا۔ اب اس کی مدت ایک  
ماہ کر دی گئی ہے۔ مزم قید تنہائی میں رہتا ہے۔ ورزش کرتا ہے۔ اور گر جا  
جاتا ہے۔ لیکن اپنے ساتھیوں سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ یہ دور سخت



تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دوسرا دور ذرا طویل ہوتا ہے۔ اس دور میں قیدی مشقت دوسروں کے ساتھ مل کر کرتا ہے۔ رات کو علیحدہ ہوتا ہے۔ دوستوں اور رشتہ داروں سے مل سکتا ہے۔ اس نظام کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ قیدی میعاد اسیری میں اچھا کارہ نگین کر سکتا ہے۔ روزانہ کام کارہ نگین رکھا جاتا ہے۔ قیدی کی محنت کے ساتھ ساتھ اس کو خوراک اور رہائش کی مراعات ملتی رہتی ہیں۔ اور اس کی سزا میں کمی ہوتی رہتی ہے۔

۵ سال کی سزا میں ایک سال اور ۹ دن۔ دس سال کی سزا میں ایک سال اور ۳، ۲، ۱ دن۔ چھوہ سال کی سزا میں تین سال اور ۷، ۵ دن۔ بیس سال کی سزا میں چار سال اور ۲۰ دن کی کٹوتی ہر قیدی کو ملتی ہے۔ عمر قید والے لوگ کسی تخفیف کے حقدار نہیں ہوتے لیکن ۲۰ سال کے بعد ان کے مقدمہ پر از سر نو غور کیا جاتا ہے۔

پرسہ رعایتیں لے کر مجرم تیسرے دور میں داخل ہوتا ہے۔ قیدی رہا تو ہو جاتا ہے، لیکن مشروط طور پر۔ اگر اس حالت میں مجرم کوئی قانون توڑتا ہے۔ تو اس پر پھر سے پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے بعد ہندوستان میں جیلوں کا باقاعدہ انتظام قائم ہوا۔



۱۸۳۸ء میں بنگال - مدراس - بمبئی اور سرحد میں دیوانی قیدیوں کے لئے اڑٹھ ٹالینس۔ نو ہزار سی قیدیوں کے لئے پچھتر۔ اور عام دوسرے قیدیوں کے لئے اڑسٹھ جیلیں بنیں۔ جن میں ۷۲، ۷۹ قیدی رکھے جاسکتے تھے۔ ان دنوں قیدیوں سے سڑکوں کی تعمیر اور آبادی سے دور مکان بنوائے جاتے تھے۔ یہ مشقت اہم ترین سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں قیدیوں سے مشقت لینے کا کوئی قانون نہیں تھا۔ اور نہ قیدیوں کے لئے جیلوں میں خوراک کا انتظام تھا۔ بلکہ سکے کی صورت میں رقم دی جاتی۔ اور سپاہیوں کی نگرانی میں قیدی بازار سے روٹی کا سامان خرید لاتے۔ ان دنوں سپاہیوں کا قیدیوں پر کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ سپاہیوں کے پاس کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا، جیسے کہ اب ہیں۔

۱۸۵۴ء اور ۱۹۰۰ء میں پہلا اور دوسرا جیل ایکٹ نافذ کیا گیا۔ ان قوانین سے جیل کے اندر باقاعدہ نظام قائم کیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ میڈیکل آفیسر۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ۔ دربان۔ قیدی کے فرائض۔ ڈسپنر۔ کھانا۔ کپڑا۔ بلڈنگ۔ صحت۔ بیماریوں کے علاج وغیرہ انہی قوانین کے ذریعے نافذ کئے گئے۔

۱۹۲۶ء میں ہندوستان کی تمام جیلوں میں انگلستان کی طرح عادی مجرموں کے لئے الگ اور نئے مجرموں کے لئے الگ جیلیں تعمیر



کی گئیں۔

چنانچہ نیوسنٹرل جیل ملتان اور گجرات کی سپیشل جیل اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ فننگری جیل جسے قیدیوں کی زبان میں ساہیلوال کی جیل کہا جاتا ہے۔ عادی مجرموں کے لئے وقف ہے۔ اسی طرح ملتان نیوسنٹرل جیل میں میعاد می قیدی رکھے جاتے ہیں۔

— ۲ —

عام طور پر دیکھے میں آیا ہے کہ جیل خانے کی عمارت کا محل وقوع آبادی سے دور ایسی جگہ واقع ہوتا ہے، جہاں زمین ریتی یا خشک ہو۔ سطح زمین سے چار پانچ فٹ گہرائی پر اس کی نیو اوٹھائی جاتی ہے۔ پہلا بڑا دروازہ لوہے کا ہوتا ہے۔ اگلے وقتوں میں دوسرا دروازہ عام طور پر لکڑی کا یا لوہے کی سلاخوں کا ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ بھی لوہے کا بنا دیا گیا ہے۔ ان دونوں دروازوں کے درمیان کا حصہ ڈیوڑھی کہلاتا ہے۔ اور یہاں حکام کے دفاتر ہوتے ہیں۔

ڈیوڑھی میں دربان کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ پولیس سے مجرم یا ملزم یہیں وصول کئے جلتے ہیں۔ قیدی کی تلاشی لینے کے بعد اس کے جرم کا اندراج کیا جاتا ہے۔ پھر اسے جیل کے اندر لے جانے کے لئے نمبردار کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ وہ اسے چکر میں لے جاتا ہے۔ چکر جیل کے



وسط میں قریباً ۵ فٹ اونچی گول عمارت ہوتی ہے۔ جس پر ہر وقت ایک قیدی پریدار رہتا ہے۔ تمام جیل اس قیدی کی نظر میں ہوتی ہے۔ جیل کے منشی اور ہیڈ وارڈر اپنے عملہ سمیت یہیں بیٹھے ہیں۔

منشی تعلیم یافتہ اور معیاری قیدی کو بنایا جاتا ہے۔ وہ ہر آنے والے قیدی کا نام درج کرتا ہے۔ اگر آنے والا قیدی ہو تو اسے قیدوں کی بیرک میں بھیجتے ہیں۔ اور حوالاتی کو حوالاتیوں کی بیرک میں۔

دوسرے دن قیدی اور حوالاتی ڈاکٹر کے سامنے معائنہ

کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ جو ان کی موجودہ صحت اور وزن کا جائزہ لیتا ہے۔ قیدی ہو تو اسی وقت اس کی مشقت اس کی صحت کے مطابق تجویز کر دی جاتی ہے۔ حوالاتی کو معائنہ کے بعد اس کی بیرک میں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

گو جیل کا قانون ہے کہ ہر آنے والے قیدی یا حوالاتی کو دس دن کے لئے تنہائی کی ٹھہری میں بند رکھنا ضروری ہے۔ مگر آئین کے اس حصہ پر کم عمل ہوتا ہے۔

جیل میں مختلف وارڈ ہوتے ہیں۔ بعض جیلوں میں بیرکس کم اور تنہائی کی کوٹھڑیاں زیادہ اور بعض میں اس کے برعکس انتظام ہوتا ہے۔

جیل کی زبان میں ان وارڈوں کو احاطے کہتے ہیں۔ ہر احاطہ میں



الگ الگ قسم کے قیدی رکھے جاتے ہیں۔

جن پر عدالت میں ابھی کوئی حرم ثابت نہیں ہوا وہ حوالاتی کہلاتے ہیں۔ جن کی سزائیں طویل ہوتی ہیں، ان کے لئے جدا بیری رکھی ہوتی ہیں۔ جن کی سزا سال سے کم ہو۔ اور وہ اپنی سزا کا تیسرا حصہ شرافت سے کاٹ چکے ہوں۔ تو ان کے پاؤں میں لوہے کا کڑا پہنا کر جیل سے باہر کام کرنے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ انہیں باہر کا پنجنہ کہتے ہیں۔ یہ قیدی جیل کے متعلقہ افسران کے گھروں میں اور دیگر جگہوں پر مثلاً کھیتی باڑی۔ باغبانی وغیرہ کاموں پر لگائے جاتے ہیں۔ دن بھر کام کرنے کے بعد سیر شام پھر انہیں جیل واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ اور یہ الگ بیریک میں بند ہوتے ہیں۔

اکثر قیدی جیل کے کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ کچھ قیدی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی مشقت دن بھر جیل کی صفائی ہوتی ہے انہیں "مشقتی" کہتے ہیں۔ ان میں جھاڑو مار۔ حجام۔ دھوبی وغیرہ شمار ہوتے ہیں۔ ان سب کی حاضری صبح و شام چکر میں یا پھر اپنی اپنی بیریک میں ہوتی ہے۔ نابالغ مجرموں کے لئے انتظام علیحدہ ہوتا ہے۔ اسے بچہ خانہ کہتے ہیں۔ اس احاطہ کا انچارج عمر رسیدہ وارڈ یا نمبر دار ہوتا ہے۔ عورتوں کے لئے زنان خانہ کا انتظام ہے۔ اس کی منتظمہ ایک



بوڑھی عورت ہوتی ہے۔ اس کمرہ میں سپرنٹنڈنٹ یا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے  
علاوہ کوئی مرد قیدی یا سرکاری ملازم داخل نہیں ہو سکتا۔

ہر احاطہ کے ارد گرد تقریباً ۵ فٹ اونچی دیوار ہوتی ہے۔ اس  
دیوار کے آگے لوہے کا دروازہ ہوتا ہے۔ جو ہر وقت مقفل رہتا ہے۔  
تمام دروازوں کا رخ چکر کی طرف ہوتا ہے۔





# لباس

موسم گرما

پنجاب کی جیلوں میں ہر قیدی کا لباس مخصوص کپڑے کا ہوتا ہے۔  
یہ کپڑے جیلوں کے کارخانوں میں قیدی تیار کرتے ہیں۔ ان میں نیلے رنگ  
کی دو دھاریاں ہوتی ہیں۔ موٹا گارٹھے کا نیم آستین والا کرتہ۔ پاجامہ  
بھی، اسی کپڑے کا بنایا جاتا ہے۔ ایک ٹوپی۔ ایک چادر۔ رومالی  
اور پیرنا اس کے علاوہ ہوتے ہیں۔

موسم سرد

کرتہ۔ پاجامہ۔ پیرنا۔ چادر۔ رومالی۔ ٹوپی۔ کمبل تین عدد۔ ایک  
کوٹ جو کپڑوں کا بنایا جاتا ہے۔ اور لکڑی کے بدن۔ جیسے جیسے سردی



بڑھتی ہے قیدی کے کبلوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ سردی کے جوان موسم  
 میں ہر قیدی کے پاس چھ کبل ہوتے ہیں۔ یہ تمام لباس چھ ماہ کے لئے دیا  
 جاتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی پھٹ جائے، یا گم ہو جائے۔ تو اس کی  
 اطلاع متعلقہ افسروں کو دینی پڑتی ہے۔

جو تھائی قید کاٹنے پر قیدی کو ایک نشان نگرانی جس کو پلہ  
 کہتے ہیں دیا جاتا ہے۔ اس کے لباس میں پگڑی۔ شلوار اور سفید قمیص  
 سیٹی کے اضافے کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ یہ پلے والا نمبر دار کہلاتا ہے۔ کچھ  
 مدت گزرنے پر کالی وردی دی جاتی ہے۔ پگڑی۔ گرتہ اور شلوار  
 کالے رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ کالی والا نمبر دار کہلاتا ہے۔ چھ ماہ بعد  
 پیلے رنگ کے کپڑے پہنوائے جلتے ہیں۔ اور یہ پیلی والا کہلاتا ہے۔  
 یہ تینوں مختلف رنگ کے قیدی جیل میں اتنی آزادی حیثیت کے  
 مالک ہوتے ہیں۔ ان کی سزائیں کافی تخفیف ہوتی ہے۔ پیلی والا مہینے  
 کے پندرہ دن کاٹا ہے۔ کالی والا مہینے کے بائیس دن۔ اور پلے والا  
 چوبیس دن۔

باقی عام قیدیوں کو مہینے میں دو دن معافی ملتی ہے۔

ایک اور لباس بھی کبھی کبھار دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ ہے سترخ رنگ کا

لباس جو قیدی جیل کی چار دیواری پھاند کر قرار ہو جائے۔ لیکن دوبارہ



پکڑا جائے اور پھر جیل میں لایا جائے۔ تو اسے سر سے پاؤں تک سرخ  
کپڑے پہنا دئے جاتے ہیں۔

اگر کوئی انگریز مجرم بن کر آئے۔ تو اس کے لباس میں کوٹ پتلون۔  
کالر۔ ٹائی۔ رات کو سونے کا لباس۔ ایک جوڑا بوٹ۔ ایک جوڑا جراب۔  
تین سوئی قمیص۔ سر کے لئے ہیٹ۔ کنگھی۔ تولیہ۔ صابن اور پلنگ۔  
اشیائے ضروری میں شامل ہوتے ہیں۔

پاکستانی قیدی کے بستر میں ایک تپڑی جو سوخ کی رسی سے  
بہی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک درمی جس کا طول و عرض ساڑھے پانچ فٹ  
ہوتا ہے۔ یہ تمام اشیاء جیلوں میں قیدیوں کی خود ساختہ ہوتی ہیں۔  
ٹاٹ کی وردی بھی گستاخ قیدیوں کے لئے ہے۔ یہ وردی گرمی  
کے موسم میں قیدی کو بڑی تکلیف دیتی ہے۔

قیدیوں کا یہ لباس برس یا برس تک رہتا ہے۔ لیکن اب اکثر  
لباس میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ مثلاً کالے اور پیلے کا لباس اب جیلوں  
میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کی جگہ نمبر داروں کو اب سرخ رنگ کی  
فوجی قسم کی ٹوپی پہننے کو دی جاتی ہے۔ اور عادی مجرموں کو جہیں جیل  
کی زبان میں دوبارہ قیدی کہتے ہیں۔ پیلے رنگ کی عام ٹوپی دی  
جاتی ہے۔



# برتن

جیسے جیسے زمانہ گزرتا جا رہا ہے ہر چیز میں تبدیلی آتی جا رہی ہے۔  
 ۱۹۳۰ء سے پہلے جیل خانوں میں لوہے کے برتن استعمال ہوتے تھے۔ لیکن  
 گزشتہ برسوں سے لوہے کی جگہ مٹی۔ ایلو مینیم اور پتیل لے لی ہے۔  
 ۱۹۳۰ء میں بورٹل جیل کے قیدیوں کو المومینیم کی تھالی اور پیالہ  
 دیا جاتا تھا۔ لوہے کی باٹیاں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ لنگر میں جہاں قیدیوں  
 کا کھانا پکتا تھا۔ لوہے کے بڑے بڑے ڈرم استعمال میں لائے جاتے  
 تھے۔ جن کے سبب سے کھانے کی رنگت سیاہ ہو جاتی تھی۔ اور قیدی  
 کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ لیکن اب پتیل اور تانبے کی دیگیں استعمال  
 ہونے لگی ہیں۔ گو انہیں برسوں تک قلعی نہیں کرایا جاتا، تاہم کام



دے رہی ہیں۔

عام قیدیوں کو مٹی کے پیالے اور ایلونیم کی تھالیاں دی جاتی ہیں۔ پانی کے لئے مٹی کی گھڑیاں قیدیوں کے پاس ہوتی ہیں۔ بعض کو یہ گھڑیاں جیل کی طرف سے مل جاتی ہیں۔ اور اچھے قسم کے قیدی یہ برتن بھی گھر سے منگوا لیتے ہیں۔





# خوراک

آج دنیا میں سب سے اہم مسئلہ خوراک کا ہے۔ حاکم اور محکوم دونوں اس کشتی میں برابر کے سوار ہیں۔

آزاد فضا میں سائٹس لینے والے ایک دوسرے کو گرگ آسانگا ہوں دیکھ رہے ہیں۔ ایک ملک دوسرے کے خلاف سنگین تانے کھڑا ہے۔ جب با اختیار لوگوں کا یہ حال ہو۔ تو قیدیوں کی خوراک کا سوال اتنی اہمیت کیوں نہیں رکھتا؟

مجبور اور پابند سلاسل لوگوں کا یہ گروہ جن کے جسم کا رُواں رُواں ایسے لوگوں کے بس میں ہو۔ جو زندگی اور موت دونوں پر اختیار رکھتے ہوں۔ کس طرح بہتر خوراک حاصل کر سکتا ہے۔



۱۹۳۰ء سے قبل جیل خانوں میں درختوں کے پتے اور آٹے کا چھان  
 قیدیوں کی خوراک میں شامل تھے۔ پھر ذرا ترقی ہوئی۔ تو ان میں چنوں کا  
 آٹا شامل کر دیا گیا۔ چنوں ملی روٹی جب قیدی کے ہاتھ پر آتی تھی تو چھوٹی سی  
 رہ جاتی تھی، باقی زمین پر گر جاتی تھی صرف جیل کے ہسپتالوں میں بیمار  
 قیدیوں کو گندم کی روٹی دی جاتی تھی۔

اتوار کے دن عام قیدیوں کو گندم کی روٹی اور  
 چنوں کی دال دی جاتی تھی۔ عام طور پر سبزی میں بھی درختوں کے پتے  
 استعمال ہوتے تھے۔

۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ راقم کو جیل جانا پڑا۔ اس زمانے میں قیدیوں کو  
 گندم کی روٹی ملتی تھی۔ اور گذشتہ سالوں کی سوکھی ہوئی سبزی کی بھاجی۔  
 شلغم جب اپنا موسم چھوڑ چکے۔ اور ان میں جالی پڑ جاتی تھی۔  
 یہ موسم شلغموں کے اس موسم میں داخل ہے۔ جب ڈھور ڈنگر بھی ان سے  
 منہ موڑ لیتے ہیں۔ تب جیل والے انہیں ٹکڑے کر کے دھوپ میں ڈال دیتے  
 تھے۔ اور دوسرے سال قیدیوں کو دئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کدو  
 اور ساگ کی سبزی بھی عام استعمال میں آتی۔ ساگ میں مولیٰ اور شلغم  
 کے پتے عام پکائے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھار خشک آلو بھی ملتے تھے۔  
 صبح کے وقت دال ملتی تھی۔ جس میں ارہر کی دال۔ مسور اور ماش



کی دال اتوار کے دن اور چنوں کی دال عام پکتی تھی۔ چنے اور گڑ تو ہر موسم میں ملتا ہے۔ اور دلیا صرف بیمار قیدیوں کو ڈاکٹر کی سفارش پر لیسر آتا تھا۔ اس دور میں بوسٹل جیل کے قیدیوں سے امتیازی سلوک روار کھا جاتا تھا۔ چونکہ ان دنوں قیدیوں کو ایک روپیہ چار آنے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس میں سے چار آنے ماہوار وضع کر لئے جاتے تھے۔ اور اس کی مٹھائی یا مصری دی جاتی تھی۔ باقی رقم قیدی کے حساب میں جمع ہو جاتی۔ اور رہائی کے وقت اُسے دی جاتی تھی۔

تہواروں پر قیدیوں کے لئے کوئی امتیازی کھانا نہیں پکاتا تھا۔ اُس زمانے میں دونوں وقت کی خوراک کی قیمت تین آنے پر پڑتی تھی۔ اور آج قیدی کی خوراک ۹ آنے کے قریب ہے۔ مثلاً:-

آٹا	(دونوں وقت)	دس چھٹانک
دال	" "	آٹھ "
لکڑی	" "	آدھ سیر
نمک مرچ مصالحہ	" "	(حسب ضرورت)
سبزی	" "	دو چھٹانک
تیل برائے سبزی	" "	۲ ۱/۲ "
گڑ	(شام کے وقت)	ایک "



دیا (صبح ہفتہ میں چار دن)

چنے (صبح ہفتہ میں تین دن)

گوشت گائے (ہفتہ میں دو دن)

### حوالاتی کی خوراک

آٹا	(دونوں دقت)	آٹھ چھٹانک
دال	" "	۲ ۱/۴ تولہ
تیل	" "	" ۲ ۱/۴
چنے	(صبح)	ایک چھٹانک
گرٹ		

یہ خوراک پہلے سے بہتر ہے۔ اور پہلے سے بہتر پکیتی ہے۔ ہفتہ میں دو دن گوشت کبھی پلاؤ کی صورت میں اور کبھی صرف شوربا پکتا ہے۔ تنور کی اچھی پکی ہوئی دو روٹیاں ملتی ہیں۔ صبح کو دو سبزیاں۔ شام کو دال۔ مگر اب ارہر کی دال کی جگہ مونگ کی دال ملتی ہے۔ باقی وہی سلسلہ ہے۔ یعنی ماش کی دال۔ مسور کی دال اور اتوار کو چنے کی دال۔ عید کے تہوار پر قیدیوں کیلئے سویاں، ان کے حصے کا گرٹ ڈال کر پکائی جاتی ہیں۔ اور قیدی عید کی خوشی میں یہ سرکاری تحفہ قبول کرتا ہے۔

سبزی میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ حالانکہ جیل سے باہر کھیتوں



میں قیدی کاشت کرتا ہے۔ قیدی ہل چلاتا ہے۔ قیدی اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ لیکن جب سبزی تیار ہوتی ہے۔ تو حکام جیل اور دیگر ملازم اس پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ اور غریب قیدی کو اس وقت سبزی کھانا نصیب ہوتی ہے۔ جب ڈھور ڈنگر سے کھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور پھر یہ سبزی اس ٹوکے سے کاٹی جاتی ہے۔ جس سے سیلوں کے لئے چارہ کاٹا جاتا ہے۔

آج ہر قیدی اپنے گھر سے معین مقدار میں گھی۔ چینی۔ شکر اور گڑ منگو سکتا ہے۔ تیل سرسوں اور صابن ہمہ اقسام بھی اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ لیکن پیشتر ازیں یہ اشیاء جیل میں جرم سمجھی جاتی تھیں۔ اگر کسی قیدی کے پاس ان کا ثبوت مل جاتا۔ تو اس کے جسم کی چمڑی اس طرح فضا میں رقص کرتی۔ جس طرح دھنیا روئی دھنتا ہے۔

آج بھی بعض ریاستیں اپنے قیدیوں سے وہی سلوک کرتی ہیں۔ جسے زمانہ برسوں سچھے چھوڑ آیا ہے۔ ریاستوں میں قیدی دن بھر کاٹھ مارے رہتے ہیں۔ اور شام کو اپنے لئے گاؤں سے روٹی مانگ لاتے ہیں۔

یورپ نے اپنی ترقی کے ساتھ جیل خانوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ وہاں کے عام قیدیوں کی خوراک دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔



ہر روز صبح ناشتہ میں دیا جائے اور چھ اونس ڈبل روٹی  
اتوار کے دن گوشت (گائے)

سوموار کے دن گوشت (سور) سبزی اور روٹی  
منگل تا جمعرات - سبزی (ہمہ اقسام) اور روٹی۔

جمعہ کے دن - ثابت گوشت (ران کی قسم) شوربا والا۔  
ہفتہ کے دن - قیمہ اور روٹی۔

ان کے علاوہ آلو کی سبزی ہر روز ملتی ہے۔

لیکن ہمارے ہاں غریب قیدی کو جو خوراک ملتی ہے۔ اگر وہی

دیانت داری کے ساتھ ملتی رہے تو غنیمت ہے۔ مگر حکام جیل کا پیٹ ہی

اتنا بڑا ہے کہ اس سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ قیدی کی خوراک سے سپرنٹنڈنٹ

اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی بھنسیں۔ ڈاکٹر کی بھنسی۔ اور دیگر ملازموں کی گائیں،

اور وارڈروں کی بکریاں اپنا پیٹ پالتی ہیں۔ گھر کی تمام ضروریات روزانہ

زندگی میں استعمال آنے والی چیزیں۔ لکڑی۔ آٹا۔ سبزی۔ گھی۔ تیل یہ سب

کچھ قیدی کے راشن سے کاٹ کر متعلقہ حکام کے گھر جاتے تھے۔ قیدی کے

لئے آبی ہوئی دال ہی غنیمت ہے جس سے وہ پیٹ کا دوزخ بھرتا ہے۔

اس پر بھی جو سلوک قیدی کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسانیت کے پاس اس کا

کوئی جواب نہیں۔



## سزا

بیس پچیس برس پھیپے مڑا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جیل خانوں میں قصاب بستے تھے۔ اور یہاں انسانوں کو بھیرٹ، بکری کی طرح ذبح کیا جاتا تھا۔ اور اس پر تاکید یہ تھی۔ کہ ۶ گھنٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے۔

اگر آواز ذرا اونچی ہوئی، تو سپرنٹنڈنٹ صاحب اور وارڈن ناراض ہو جائیں گے۔ ان کی ناراضگی خدا کے ناراض ہو جانے کے مترادف تھی۔

یہ واقعہ ہے کہ جیل خانے میں سپرنٹنڈنٹ دوسرا خدا ہوتا تھا



اور آج بھی ہے۔

جیل میں تشدد کی تاریخ کا غد پر نہیں، وہاں کے درو دیوار پر  
 کندہ ہے۔ مورخ چلے تو آج بھی اسے اندھی اور بہری دیواروں کے  
 سائے شہادت دیں گے۔ کہ یہ زمین صدیوں کی انسانی تزییل کا گہوارہ  
 چلی آرہی ہے۔





# قیدیوں کی مشقت

بان بٹنا۔ مویخ کو ٹنا۔ بیت کی کرسیاں بٹنا۔ چرخہ کا ٹنا۔ کوہو چلانا۔  
خراس چلانا۔ غالیچہ بٹنا۔ کپڑا بٹنا۔ درمی بٹنا۔ جگائی (پرانے دفتری  
کاغذوں کا ملیو) کرنا۔ روٹی پکانا۔

البتہ بورٹل جیل میں ایک ورکشاپ ایسا ہے۔ جس میں درزی۔  
لوہارہ۔ رنگریزی۔ دھوبی۔ پرٹنگ وغیرہ کا کام کم عمر قیدیوں کو  
سکھایا جاتا تھا۔

اگرچہ ان میں سے اکثر مشقتیں آج ختم کی جا چکی ہیں۔ تاہم جو باقی  
ہیں، ان سے نہ تو قیدی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور نہ حکومت کو فائدہ۔  
بہر حال دونوں اپنا اپنا وقت پاس کرتے ہیں اور بس۔



لیکن یہاں تک قیدی کے قصور وادہ ہونے کا تعلق ہے۔ عدالت کی سزا کے علاوہ جیل حکام اُسے الگ اپنی سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ جو قیدی مشقت سے انکاری ہو۔ اُس کے لئے حسب ذیل سزاؤں میں سے کوئی سی سزا تجویز کی جاتی ہے :-

۱- چکی پسینا

۲- تنہائی کوٹھڑی

۳- بیرٹی

۴- ڈنڈا بیرٹی

۵- کھڑی ہتھکڑی

۶- ٹاٹ وردی

۷- اور آخری سزا کٹنگلی سے باندھ کر بید نہنی۔

یہ تمام سزائیں برداشت کرنے والا قیدی حکام جیل کی نظر میں ایک عجوبہ بنے سمجھا جاتا ہے۔ بالخصوص عام قیدی اُس کے لئے عزت اور خوف کے ملے جلے جذبات رکھتے ہیں۔ وہ نہ تو کوئی مشقت کرتا ہے۔ اور نہ کوئی اُسے کام ہی دیا جاتا ہے۔ وہ تمام دن جیل خانہ کی زمین اپنی آوارگی سے روندنا پھرتا ہے۔ شام و صبح اچھی خوراک کھاتا ہے اور اچھا لباس پہنتا ہے۔ گویا ہر اُس کا لباس اسی کپڑے کا ہوتا ہے۔ جو عام قیدی پہنتے ہیں۔



# افیسرز

جیل خانے کا نظام بہت سے آفیسروں پر مشتمل ہوتا ہے :-

سپرٹنڈنٹ

ڈپٹی سپرٹنڈنٹ

اسسٹنٹ سپرٹنڈنٹ

سید وارڈر

وارڈر

ٹمبردار (یہ قیدی ہوتا ہے)

بیرونی آفیسر

وزیر جیل خانہ جات



ہوم سکریٹری صوبہ گورنمنٹ  
ڈپٹی ہوم سکریٹری صوبہ گورنمنٹ  
انسپیکٹر جنرل جیل خانہ جات

آخر الذکر آفیسر جیل کی اصطلاح میں آئی۔ جی یا عام قیدیوں  
کی زبان میں جرنیل کہلاتا ہے۔

صوبہ کی تمام جیلوں کے سپرنٹنڈنٹ آئی۔ جی کے تحت ہوتے  
ہیں۔ اور آئی۔ جی ہوم سکریٹری صوبہ گورنمنٹ کے تحت ہوتا ہے۔  
سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ پہلے انگریزوں کے پاس ہوتا تھا لیکن  
آہستہ آہستہ یہ ذمہ داری پاکستانی آفیسروں کے سپرد کی گئی۔  
"سب" جیلوں کا سپرنٹنڈنٹ عام طور پر ضلع کا مجسٹریٹ ہوتا ہے۔  
اور ڈسٹرکٹ جیل میں یہ عہدہ میڈیکل سول سرجن کے پاس ہوتا  
ہے۔ تاکہ قیدیوں کی صحت کی ذمہ داری بھی سنبھال سکے۔ لیکن  
سنٹرل جیل کا سپرنٹنڈنٹ کسی کہنہ مشق آفیسر کو لگایا جاتا ہے۔  
سپرنٹنڈنٹ ایک قسم کا خدا ہوتا ہے۔ اس کے اختیار میں اس قدر  
وسعت ہوتی ہے۔ کہ وہ ایک قیدی روزانہ رہا کر سکتا ہے۔ یا ایک  
بہینہ سزا میں تخفیف کر سکتا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ ہفتہ میں ایک دن جیل کے ہر احاطہ کا دورہ



کرتا ہے۔ اس دن قیدی اپنے کپڑے اور متعلقہ برتن صاف کر کے  
 قطار اندر قطار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جس قیدی کو سپرنٹنڈنٹ  
 سے کوئی سوال کرنا ہو وہ دونوں ہاتھ سامنے کر کے اپنی جگہ بیٹھ جاتا  
 ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قیدی کوئی مطالبہ کرنا چاہتا ہے۔  
 پیشتر یہ رواج نہیں تھا۔ بلکہ جس قیدی کو سوال کرنا ہوتا تھا۔  
 وہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور سپرنٹنڈنٹ اس قیدی کے سامنے رک جاتا تھا۔  
 مگر اس طرح بعض قیدیوں کے ہاتھوں تقسیم سے قبل اکثر سپرنٹنڈنٹ  
 زخمی ہو چکے ہیں۔ اس بناء پر موجودہ طریقہ رائج کیا گیا۔

ڈیپٹی سپرنٹنڈنٹ

یہ عہدہ شروع سے پاکستانی آفیسروں کے پاس رہا ہے۔  
 اس کی ذمہ داری سپرنٹنڈنٹ سے کہیں زیادہ ہے لیکن تنخواہ کم۔  
 جیل کے اندرونی نظام کی دیکھ بھال اسی کے سپرد ہوتی ہے۔  
 ہر شام قیدیوں کو بند کرنا اور ہر صبح کھولنا اسی کے فرائض میں ہوتا ہے۔  
 ڈیپٹی سپرنٹنڈنٹ پندرہ دن تک قیدی کو معافی بھی دے سکتا  
 ہے۔ اس عہدہ کی ایک مخصوص وردی ہوتی ہے۔

ہیڈ وارڈن

یہ عہدہ عام طور پر پرانے اور تجربہ کار وارڈن کو دیا جاتا ہے۔



جیل کے اندرونی نظم و نسق کے سنبھالنے میں یہ عہدہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ  
کا معاون ہوتا ہے۔

وائڈر

یہ عام ملازم ہوتا ہے جیسے سپاہی۔ یہ دن میں چھ گھنٹے نوکری  
دیتا ہے۔

نمبر دار

قیدیوں میں سے ایسے قیدی کو یہ عہدہ ملتا ہے۔ جو اپنی قید کا  
چوتھائی حصہ نیک چلتی سے گزار چکا ہو۔ اس کی کوئی تنخواہ نہیں ہوتی۔  
لیکن عام قیدیوں سے اس کی معافی زیادہ ہوتی ہے۔

الارم

مصائب کی اس محدود دنیا میں بھی لوگ آپس میں دست  
گرمیاں ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی پگڑی اچھالتے ہیں۔ اور  
ایک دوسرے کے خلاف افسانے تراشتے ہیں۔

فساد کی بنا کبھی تو قیدیوں کی اخلاقی گراؤٹ ہوتی ہے۔  
اور کبھی حکام جیل کی زیادتی۔

بعض اوقات تو باہر کے جھگڑے اندر وجہ تفریح ثابت ہوتے  
ہیں۔ جس کی بنا پر لڑائی کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن جیل کے حکام نے نمبر دار



اور وارڈروں کو وردی کے ساتھ سیٹی بھی دے رکھی ہے۔ یہ سیٹی ہر وقت ان لوگوں کی جیب میں ڈوری سے بندھی رہتی ہے۔ اگر کسی وقت کسی احاطہ میں لڑائی جھگڑے کا خدشہ ہو۔ تو ڈیوٹی پر کھڑا نمبردار یا وارڈر فوراً سیٹی بجاتا ہے۔ اس کی آواز جہاں کہیں جس کسی نمبردار یا وارڈر کے کان میں پہنچتی ہے۔ وہ وہیں سے سیٹی بجانا شروع کر دیتا ہے۔ ان آلاتوں پر چکر سے الارم بجاتا ہے۔ عین اسی وقت ڈیوٹی سے باہر کے الارم کی آواز آتی ہے۔ اس وقت جیل میں عجیب سماں ہوتا ہے۔ خوف و ہراس، ہوش و انتقام ہر قیدی کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے جذبات سے متاثر قیدی کان اور آنکھیں جیل وقوع کی طرف لگا کر نتیجہ کے منتظر رہتے ہیں۔

قیدی اپنی اپنی پیرکوں میں بند کروئے جاتے ہیں۔ پیرکوں میں سمیت تمام عملہ لاکھڑوں اور ڈنڈوں سے مسلح ہو کر جائے وارڈرات پر پہنچ جاتا ہے۔ اور بلا امتیاز قیدی ہو کہ حوالاتی، گنہ گار ہو کہ بیگناہ سب کی پٹائی شروع ہو جاتی ہے۔ سب ایک ہی ڈنڈے سے ہانکے جاتے ہیں۔ یہ اقدام اس وقت جیل کے امن کو بحال کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ ایسے ہنگامے میں اگر کوئی موت واقع ہو جائے۔ تو اس کی ذمہ داری حکام جیل پر نہیں ہوتی۔ اس قسم کا اقدام قیدیوں کی جیل سے فرار کے وقت بھی کیا جاتا ہے۔



جیل کی تاریخ میں ایسے واقعات بھی ہیں کہ اگر کسی قیدی سے حکام تنگ  
 آچکے ہوں، تو اس سے نجات کے لئے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور موقع  
 ملنے پر قیدی کو قیدیوں کے ہاتھوں موت کی آغوش میں پھینک دیا جاتا ہے  
 اور پھر چکے سے اسے کورٹ موقع کے قریب ڈال کر الارم کر دیا جاتا ہے  
 اس سے یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ یہ دیوار پھاند کر فرار ہونے کی کوشش کر  
 رہا تھا۔ تقسیم ملک سے قبل ایسے اکثر واقعات سننے میں آتے رہے۔

جیل کی دنیا میں الارم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور سپرنٹنڈنٹ  
 اس کے لئے جواب دہ ہوتا ہے۔ کوئی واقعہ اگر ایسا ہو جائے کہ الارم کرنا پڑے  
 تو حکام جیل کی کوشش ہوتی ہے کہ اس چنگاری کو ہوا دینے کی بجائے  
 دبا دیا جائے۔ تاکہ حکام بالا سے جیل کی انتظامی کو چھپایا جائے۔

### بد معاشی

شہر یا محلہ میں ایک چور لیستا ہو تو وہاں کے لوگ اس سے تنگ آ  
 جاتے ہیں۔ مگر جیل خانہ تو سارا گاؤں چوروں کا ہے۔ یہاں پر نئے اور  
 پرانے چور ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں  
 ایک سے ایک بڑھ کر چور یہاں تقدیر کے چکر میں۔ تدبیر کے بل پر قید کے  
 کون گن رہا ہوتا ہے باوجود اس کے وہ اپنے کام کی مشق جاری رکھتا ہے۔  
 اس چار دیواری میں روٹی کے سوا ہر چیز نا جائز ہے۔



مرچ  
 نمک  
 پیاز  
 لہسن  
 سگریٹ  
 ایفون  
 چرس  
 بلیڈ  
 گھر کا کپڑا  
 نقدی  
 گھی  
 شکر  
 چینی  
 آم تینہ  
 کنگھی

خالی بوتل ( کسی قسم کی ہو )  
 اخبار..... کتاب



یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر کام آتیں ہیں۔ ان میں اکثر تو ایسی ہیں جن کے بغیر آدمی ایک قدم نہیں چل سکتا۔ لیکن حیل قانون کی نظر میں یہ سب اشیاء بدمعاشی میں شمار ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک چیز بھی اگر کسی قیدی کے پاس پائی جاتی تھی تو وہ سزا کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج ان میں سے اکثر کی اجازت قیدیوں کو مل چکی ہے۔ لیکن جب یہ سب کچھ خلاف قانون تھا تب بھی قیدیوں کے پاس یہ سب کچھ موجود ہوتا تھا۔



# جیل کی اصطلاحات

ہر ملک کی اپنی ایک زبان ہے۔ اور ہر زبان کے چند محاورے۔  
استعمالے یا اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ ادیب خواہ کسی زبان کا ہو۔ ان تینوں  
کے بغیر اس کی جامعیت سے انکار کرنا پڑے گا۔

ہمارے ہاں روزمرہ کی بول چال میں ایسے الفاظ غیر ارادی طور پر  
بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ کاروباری ماحول کے بھی چند مخصوص جملے ہیں و فائر  
کی بھی ایک زبان ہے۔ شرابی اور جوارے بھی آپسی کی گفتگو میں جن الفاظ  
کا تبادلوہ کرتے ہیں۔ انہیں بھی اکثر زبان کے محاوروں کا استعمال ہوتا ہے اسی  
طرح جیل خانہ بھی ایک بستی ہے۔ یہاں کے بھی چند محاورے ہیں۔ گو الفاظ کی  
کمی ہے تاہم اس محدود ماحول میں مخصوص محاورے، اصطلاحوں کا استعمال بھی



صبح سے شام تک بے محابا ہوتا ہے۔ مثلاً :-  
**”سب اچھا“**

رات کو چکر سے نمبر وار جیل کی تمام بیسروں کے نام لے کر آواز دیتا ہے۔ جواب میں آواز آتی ہے ”سب اچھا“ (سب ٹھیک ہے)

عام طور پر جیل میں جب قیدی، قیدی سے سربراہ ملتا ہے تو السلام علیکم کی بجائے ”سب اچھا ہے“ دوسرا جواب میں ”سب اچھا ہی کہتا ہے۔“ آفیسر بھی کسی قیدی کو سربراہ خیریت پوچھتا ہے کیوں بھی ”سب اچھا ہے“ جواب ملتا ہے ”سب اچھا ہے“

**پکار**

سر شام جیل کی گنتی کے فوراً بعد چکر سے نمبر وار تمام بیسروں کے نام لے کر پکارتا ہے۔ یہ پکار شام سات بجے سے صبح چھ بجے تک جاری رہتی ہے۔

**خدا باہر کی کھلاٹے**

یہ دعائیہ فقرہ ہے۔ قیدی جب کھانا کھا رہا ہو۔ اور کوئی دوسرا قیدی آجائے اور اسے کھانے کی دعوت دے۔ تو جواب میں دوسرا قیدی کہتا ہے خدا آپ کو باہر کی کھلاٹے۔ یعنی جلدی رہائی ملے۔

**شمیر پنچہ**

جب کوئی بھنگی قید ہو کر جیل میں آتا ہے تو اس کی مشقت لکھتے



دقت کہتے ہیں۔ اسے شیر پنخہ میں لگاؤ۔ یعنی بھنگیوں کے کام پر۔  
 نیا آدمی لفظ شیر پنخہ سن کر گھبرا جاتا ہے۔

دوباریاں مارنا ہے، (کیا فریب دیتا ہے)

چونکہ عادی مجرم چالاک اور ہوشیار ہوتا ہے وہ جیل کی تمام حرکات سے واقفیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچتا رہتا ہے بات بات پر وہ چار سو بلیں کرتا ہے۔ اس لئے اسے ڈوبارہ کہتے ہیں۔ لیکن عام قیدی بھی جب کوئی ایسی حرکت کرتا ہے۔ تو دوسرے قیدی کہتے ہیں۔ "کی دوباریاں مارنا، بچو"

پریڈ

شاید آپ یہ خیال کریں کہ پریڈ سے مراد وہی حرکات و سکنات ہیں جو فوجیوں سے کرائی جاتی ہیں۔ مگر نہیں۔ جیل میں پریڈ سے مراد سو مووار (پیر) کا وہ دن ہوتا ہے۔ جب سپرنٹنڈنٹ بمعہ اپنے عملے کے جیل کا چکر لگاتا ہے۔ اس دن عام قیدی اپنے بستر، اپنے برتن اپنے کپڑے اگلے صاف اور با ترتیب اپنے سامنے رکھ کر قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں ان کے ہاتھ میں ان کا نامہ اعمال (جیل ٹکٹ) ہوتا ہے۔ جس پر اس کے مقدمے کی تمام مختصر روئیداد درج ہوتی ہے۔ اس دن قیدیوں کو سپرنٹنڈنٹ جیل سے اپنی شکایت بیان کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔



اسے جیل کی زبان میں "پریڈ" کہتے ہیں۔

### کمبل پریڈ

یہ پریڈ پہلی پریڈ سے مختلف ہوتی ہے۔ قیدی جب کسی نمبر دار یا ملازم سے اور ایسا اوقات اپنے ایسے قیدی سے انتقام لینا چاہیں تو اسے موقعہ پا کر اپنی بئیرک میں لے آتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اس پر کمبل ڈال کر اس کی خوب مرمت کرتے ہیں اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اول تو اسے چوٹ نہیں لگتی جس سے نشان ظاہر ہو۔ دوسرے اس کا سانس اس قدر گھٹ کر رہ جاتا ہے کہ غریب موت کے قریب پہنچ جاتا ہے تب اسے چھوڑ دیتے ہیں۔

اس عمل کو جیل کے محاورے میں کمبل پریڈ کہتے ہیں۔

### جنگلہ پریڈ

جیل خانے کا یہ ایسا محاورہ ہے کہ اگر قانون میں فحاشی کی تلوار بے نیام نہ ہوتی تو اس کی تفسیر میں مجھے کوئی تردد نہیں تھا۔ تاہم جن لوگوں کو کبھی کبھار جیل جانے کا موقعہ ملا ہو۔ ان سے اس کے متعلق دریافت کیا جاسکتا ہے؟

### فلاں کو کوٹھی لگا دیا گیا

قتل کا مقدمہ جب ماتحت عدالت سے سیشن کورٹ کے سپرد ہو جاتا ہے اور سیشن الزم کو سزائے موت کا حکم سناتا ہے تو جیل والے اسے پھانسی



کوٹھڑی میں بند کر دیتے ہیں۔ یہ خاص قسم کی کوٹھڑی ہوتی ہے اسے جیل کے محاورے میں کوٹھی لگنا کہتے ہیں۔

یہاں سے ملازم یا تو برسی ہونے پر نکالا جاتا ہے یا پھر پھانسی کے تختہ پر لے جانے کے لئے بھجائے ہیں۔

### تاریخ بھرنی

زمیندار قسم کے لوگ جو فوجدار کی مقدمات میں سزا یاب ہوتے ہیں۔ ان کے ورثا جیل آفیسروں سے رابطہ پیدا کر کے انہیں کچھ نہ کچھ ماہوار دینے کا وعدہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے قیدی کو مشقت کم کرنی پڑتی ہے بعض حالات میں تو ایسے لوگ نام کے قیدی ہوتے ہیں ان کے متعلق عام چرچا ہوتا ہے کہ یہ تاریخ بھرتے ہیں۔

### تاریخی قید کاٹنا

قالون، بامشقت قیدی کو اس کی قید میں رعایتیں دیتا ہے لیکن جو قیدی شرافت کے ساتھ اپنے دن نہیں گزارتا وہ اپنی قید کے پورے دن کاٹ کر رہا ہوتا ہے۔ اسے تاریخی قید کاٹنا کہتے ہیں۔

### ۵۵ لگ گئی لے

جیل میں ۵۵ لگ گئی لے جو عام طور پر ایسے قیدیوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنے احاطہ یا بارک سے باہر پھرتا ہوا دیکھا جائے۔



جیسے باہر کی دنیا میں دفعہ ۱۰۹۔ آوارہ گرد کے لئے ہے اسی طرح  
یہ دفعہ جیل خانے میں آوارہ قیدی کے لئے مخصوص ہے۔

دنیا تے چار پیالے (دنیا میں چار ہاے)

جیل خانے کی مخلوق اس محدود دنیا کو جہنم کرہ خیال کرتی ہے جب کوئی  
قیدی اپنے جرم کی بنا پر جیل خانے آجائے تو رہائی تک وہ اپنے آپ کو  
دنیا سے الگ خیال کرتا ہے گویا جیل خانہ دنیا میں نہیں ہے۔ لہذا جب  
کوئی قیدی رہا ہوتا ہے۔ تو قیدی آپس کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ آج  
فلاں آدمی دنیا میں چار ہا ہے۔

۱۳۔ اڑتی بہ

جب توالاتی قیدی بن کر جیل میں آتا ہے تو اُسے ہر رات نئی کوٹھڑی  
یا نئی بیری ک میں بند کرتے ہیں۔ اسے جیل کی زبان میں اڑتی کہتے ہیں۔ یہ  
جیل قانون کا اہم جزو ہے۔ اگر قیدی ملی ہو۔ تو اس کا یہ چکر کئی مہینے چلتا ہے  
ورنہ تھوڑے دنوں بعد سلسلہ ختم کر دیا جاتا ہے۔



# جیل کے رات

جیسے جیسے عید کے دن قریب ہوتے جاتے مسرت کی عمر اسی قدر بڑھتی جاتی تھی۔ یعنی، ہفتے اور پھر دن ..... دنوں کے بعد گھڑیاں آخری رات تو کم بخت کٹنے میں نہیں آتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ رات برس برابر کی رات ہے۔

یہ بچپن کی بات ہے یادداشت کے خانے سے اب بھی اس کے نقوش ابھر آتے ہیں یہی حال اُس قیدی کا ہو تا ہے جس کی مہائی کے دن قریب ہوں۔ وہ اپنے وقت کے شب و روز آنکھوں میں کاٹتا ہے اس کا دل ہلکیوں اچھلتا ہے۔ وہ یوں محسوس کرتا ہے، جیسے جسم کی تمام زنجیریں ٹوٹ کر گر رہی ہیں۔ وقت کی سلطنت کا قانون شکست کھا کر لوٹ رہا ہے۔



اور اپنے رستے کی تمام دیواریں ہٹاتا ہوا صاف چلا جا رہا ہے۔  
 قفس کی تیلیاں باوجود بہاری کا پیام لے کر آتی ہیں۔ جس جگہ اس نے  
 اپنی قید کی مدت گزارا ہی تھی۔ آج وہ جیل سے اجنبی سی معلوم دیتی ہے۔  
 کیوں نہ ہو۔ وہ رہا ہو رہا ہے۔ آج اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ جیل کی  
 کوئی دیوار اس کے راتنے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

جس دن قیدی سزا ہو کر جیل آتا ہے۔ چکر میں پہنچ کر اس کے اپنے  
 کپڑے اتار کر جیل کے کپڑے پہنا دیئے جاتے ہیں۔ اگر سزا پانچ سال سے  
 زائد ہو تو گھر کے کپڑے نیلام کر دیئے جاتے ہیں۔ وعدہ گٹھڑی باندھ کر  
 اس پر قیدی کا نام اور سزا لکھ دیتے ہیں۔ یہی کپڑے رہائی کے دن واپس  
 کئے جاتے ہیں۔

رہائی کے وقت پہلے قیدی کا نام چکر کے رجسٹروں سے پھر ڈیوڑھی  
 کے رجسٹروں سے خارج کیا جاتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے  
 آخری دستخطوں سے صبح دس بجے تک قیدی کو رہا کر دیا جاتا ہے۔  
 عدالت جس تاریخ کو سزا دے رہائی اس تاریخ سے ایک دن پیشتر عمل  
 میں آتی ہے اگر حساب سے اس تاریخ کو الوار پڑتا ہو۔ تو رہائی ہفتہ کی شام  
 کو عمل میں آجاتی ہے۔



# جیل کی رات

رات ایک اندھیری چادر ہے کائنات کے چہرے پر۔  
 مخلوق سے لاتعلق انسان خالق کی خوشنودی کے لئے اسی اندھیرے  
 میں چھپ کر اپنے من کا دیا جلاتا ہے۔ تاکہ زندگی کی شام ہونے تک  
 ناہموار راہوں کی تمام مندریں باسانی طے ہو جائیں۔  
 چور اس سیاہ چادر کی سیاہی میں اپنے کو چھپا کر چوری کے لئے  
 نکلتا ہے اور نہ جانے کس قدر دلوں کی آباد بستیاں ویران کر کے اندھیرے  
 کی اوٹ میں واپس آجاتا ہے۔

اسی رات کے اندھیرے میں یار کی یار سے ملاقات ہوتی ہے من  
 کی آداس بگھیا میں بہار کے پھول کھلتے ہیں جنہیں شبنم دھو کر ساجن کے



گلے کا ہار بناتی ہے آسمان ، ان گنت ستاروں کی بے ترتیب قمیڑیں  
جلا کر رات کو چلنے والے مسافروں کو راستہ دکھاتا ہے۔

سیارے پوری طرح جاگ اٹھتے ہیں ان کی تیز روشنی سے رات کے  
ذہند لکے ماند پڑ جاتے ہیں۔

دریاؤں کے پانی دن بھر کے طوفان اور آندھیوں سے محفوظ رات  
کے دامن میں سکون کی نیند سوتے ہوئے رواں دواں زندگی کی منزل طے  
کرتے ہیں غرض رات عیب و ثواب کے تمام جلوے دیکھتی ہے اور خاموش  
ہے۔ مگر جیل کی رات خاموش نہیں ہوتی۔ یہاں کی رات کو باہر کے قانون  
سے کوئی علاقہ نہیں۔۔۔۔۔ دن بھر کے تھکے ہارے قیدی کو سر میں سات  
بجے اور گرما میں چھونچے شام اپنی جگہ مقفل کر دیا جاتا ہے۔ تمام جیل کی چابیاں  
ڈیوڑھی میں جمع رہتی ہیں۔ سہرا حاطہ میں ایک بندواری نوکری دیتا ہے اور وارڈ  
بھی جو سہرتین گھنٹے بعد تبدیل ہو جاتا ہے۔

سہ شام چکر سے پکار شروع ہوتی ہے۔ تنہائی کو ٹھٹھریوں میں بند  
قیدیوں کو سہرتین گھنٹے کے بعد نوکری پر آنے والا ملازم ”بول جوان“ کہہ کر  
پکارتا ہے اس سے مقصود رات کو قیدی کی حاضری ہوتی ہے۔

”سب اچھا اور بول جوان“ کی مسلسل آوازیں پھر چکر کی پکار ان تمام  
صدروں سے جو ہنگامہ رات بھر جیل کی دنیا میں برپا رہتا ہے اس میں



سکون کیسے مل سکتا ہے اور اس پر آفت یہ کہ کورٹ موقع کے گرد چکر کاٹنے  
والے بندواری کی آوازیں الگ شور مچائے رکھتی ہیں۔

یہ ہے جیل خانے کی رات کا فسانہ جب سارا عالم نیند کی آغوش  
میں مدہوش ہوتا ہے۔ قیدی نیند کی تلاش میں رات بھر جاگ کر گنوا دیتا  
ہے۔ حتیٰ کہ صبح ہو جاتی ہے۔



# انجمن امدادِ قیدیوں

۱۹۰۷ء میں پہلی مرتبہ کلکتے میں اس انجمن قیام عمل میں لایا گیا۔ درندہ اس سے پیشتر انگلستان کی جیلوں میں یہ ادارہ کام کرتا تھا۔ ۱۹۲۹ء تک ہندوستان کی تمام جیلوں میں انجمن امدادِ قیدیوں نے اپنا ابتدائی کام شروع کر دیا تھا۔ لیکن پنجاب کی جیلوں میں ۱۹۳۸-۳۹ء میں اس انجمن کی بنیاد پڑی۔ عام پر دیکھنے میں آیا ہے کہ قیدیوں کے درشا کو ملاقات کے وقت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ۱۹۳۹ء کے شروع میں پنجاب کی جیلوں میں باہر اچھا خاصا انتظام ہو چکا تھا، بیٹھنے کے لئے سایہ آرنجیٹ جگہ، پانی کا انتظام، رات کے رہنے کے لئے مسافر خانے، ملاقات کی درخواست تحریر کرنے کے لئے منشی مقرر کئے گئے، جیلوں کے اندر ریڈیو نصب کئے گئے۔ اس کے باوجود انجمن ہڈلنے وہ حیثیت حاصل نہ کی، جو



انگلستان کی انجمن امداد قیدیوں کو حاصل رہی۔

ہمارے ہاں جیل خالوں میں اصلاح کا کام اس قدر ہے کہ اگر ہر ضلع میں ایسی بیسیوں انجمنیں ہوں تب بھی یہ کام برسوں میں ختم نہیں ہو سکتا۔ پنجاب کے جیل خالوں کے بگڑے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انجمن ہذا ایک ایسا ڈھانچہ ہے۔ جیسے مٹی خٹنے سے مردہ اٹھا کر کسی ڈاکٹر کی دکان پر رکھ دیا جائے۔

جیلوں میں عربی اور اردو کے ابتدائی قاعدے مہیا کرنے یا ریڈیو نصب کرنے سے قیدیوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ انگلستان کی طرح ہونا یہ چاہئے تھا کہ :-

جس دن قیدی جیل خانے میں داخل ہو حکام جیل کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ انجمن امداد قیدیوں کو مطلع کریں تاکہ انجمن کا کوئی رکن قیدی سے مل کر اس کے خانگی حالات دریافت کرے اور رہا ہونے سے ایک ہفتے پیشتر اس قیدی سے دوبارہ ملاقات کر کے معلوم کرے کہ مہیا و اسیری میں قیدی نے جیل خانے میں کونسا ہنر حاصل کیا۔ پھر انجمن کے پاس ایپلائمنٹ <sup>کی بھیج</sup> کی پوری واقفیت ہوتی کہ وہ رہا ہونے والے قیدی کو ایپلائمنٹ <sup>کی بھیج</sup> کے ذریعے ملازمت دلا سکے۔



لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ملاقات کے وقت ہر درخواست پر چار آنے قیدی کے ورثات سے وصول کئے جاتے ہیں۔ یہ رقم ایک صندوقچی میں ڈال دی جاتی ہے جس کی چابی سپرنٹنڈنٹ کے قبضے میں ہوتی ہے مگر جب صندوقچی کوئی جاتی ہے تو اکثر جیلوں میں اس صندوقچی کی رقم چوتھا حصہ برآمد ہوتی ہے یہی وہ خرچ ہے جس سے انجن امداد و قیدیاں چل رہی ہے ممکن ہے صوبہ کی حکومت سے بھی مالی امداد کرتی ہو مگر انجن کے کام کو دیکھا جائے تو یہ رقم بھی کافی ہے۔

عام طور پر جیل خالوں کے ریڈیو (جو محض قیدیوں کے لئے ہوتے ہیں) یا تو خراب رہتے ہیں یا جیل آفیسروں کے گھروں کی زینت! ورنہ تنہائی میں قیدی کی زندگی میں لاسلی کے لئے کچھ دیر کے لئے عجیب کیف مسرور پیدا کر دیتے ہیں۔

سانوں مکھڑا دکھا جا سو ہے چوڑے والے

پنجابی گیت کا یہ مصرع جب اس قیدی کے کان پڑتا ہے جسے جیل خانے آئے ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔ تو اسے اپنی دلہن کی مانگ کا سینہ دیا دے آئے لگتا ہے۔ شام کے دھندلکے میں ڈھلے ہوئے آفتاب کی طرح اس کی آنکھوں کی سرخی آنسوؤں کے راستے برساتی نالوں کی طرح بہ جاتی ہے۔ برسوں پہلے گندی ہوئی کہانی کتاب زندگی کے ورق اٹنے لگتی ہے



جیسے آج ہی اس کی برات اپنے گاؤں سے گذر رہی ہے۔ گاؤں کے کھیت  
ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر برات کے آگے بچتے ہوئے باجے کی دھن پر  
سرد غنتے ہیں۔ گاؤں کی جوان لڑکیاں جو بن کے بوجھ سے بو تھیل جوانیاں  
لئے ہوئے اپنے گاؤں کے دولہا کے ساتھ ساتھ دیہاتی دوہے گاتی جا رہی  
ہیں بڑھاپے کی آخری منزل پر کھڑی بڑی بوڑھیاں گاؤں کے جوان پوتے  
کی بلائیں لے رہی ہیں۔

کیسری اور فرمزی رنگ کی پگڑیاں باندھے جوانوں کی ٹولیاں گاؤں  
کے بے ترتیب راستوں کی طرح رات کی سپید چاندنی میں برات کیساتھ  
ایسے جا رہے ہیں جیسے ان کی اپنی برات ہو۔

پڑوس سے آٹے ہوئے آتش بانے چمکے اور پھل جھڑیوں کی بارھ  
باندھی تو معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سارے گاؤں نے گامے کی شادی پر دیپ  
مالا کی ہے اور جب آتش بانے انار کو آگ دی تو آسمان سے ستارے  
برسنے لگے۔ چاند کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

اگر بوٹا غصے میں نہ آتا تو لڑائی کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔  
برات دوسری طرف سے گذر جاتی..... گاؤں کے لوگ  
بھی عجیب لوگ ہیں اتنی سی بات پر دو خون کر دیئے کہ برات ہمارے  
راستے سے کیوں گذری ہے۔



دس سال اس واقعہ کو پوچھے ہیں۔

قیدی اسی خیال میں تھا کہ لاسکی نے دوسرے نغمے کا آغاز کیا۔

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

زنج رہا ہے اور بے آواز ہے

پھانسی کو ٹھٹھری کے قیدی نے اس شعر کے مصرع اولے کو اسی

طرح دوہرایا۔ گویا اس کے دونوں پھیپھڑوں سے آواز نکل رہی ہے

جیسے کوئی ساز زندگی کے تمام تار ایک ایک کر کے توڑ رہا ہے۔ اور آگ

کے الاؤ۔ ان تاروں کو پانی پانی کر رہے ہیں..... آگ کے الاؤ!

کتنی بھیانک تھی وہ آگ..... شاید اسی تصور سے

قاتل کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ کہ پہرے پر کھڑے ملازم نے اُسے چونکا دیا۔

یہ اف نہ نہیں جیل خانوں میں ریڈیو پر فلمی گانے قیدیوں کے جذبات

سے اسی طرح کھیلے رہتے ہیں۔

جیلوں میں ریڈیو قیدیوں کے لئے کوئی مفید ثابت نہیں ہوا۔ اگر

ریڈیو ضروری مجزوبہ ہے جیل خانوں کا تو ریڈیو پروگرام میں جہاں اور بہت

سے غیر ضروری گیت اور ڈرامے کئے جاتے ہیں۔ وہاں قیدیوں کیلئے

بھی پندرہ منٹ کا پروگرام ہونا چاہئے لیکن اس کے برعکس قیدیوں کو

ایسے گیت سنائے جاتے ہیں جن میں جنسیات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔



البتہ دیہاتی پروگرام میں کچھ کارآمد باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن جب یہ پروگرام ریڈیو نشر کرتا ہے۔ تو قیدی دن بھر کی مشقت کے بعد تھک ہار کر اپنی اپنی بیروں میں بند ہو چکے ہوتے ہیں۔

جب جیلوں میں تعلیم کا باقاعدہ انتظام نہیں تو گاہے گاہے اردو کے ابتدائی قاعدے تختیاں، سپارے قرآن کریم، افسران کے سپرد کر کے جیل کی ڈیوٹی سے واپس چلے جانا کوئی خدمت نہیں کہی جاسکتی۔

فٹ بال والی بال کیرم بورڈ اور اسی قسم کی آڈٹ ڈور یا ان ڈور کھیلیں قیدیوں کے کسی کام نہیں آتیں۔ جبکہ انہیں اس کیلئے وقت ہی میسر نہیں۔ شاید ہی کوئی ایک آدھ ٹیک سیرت آفیسر ہو جسے یہ حاصل ہو۔ کہ کھیل کود کے لئے قیدیوں کو کوئی وقت دینا چاہئے۔ ورنہ بھڑ بھڑ کیوں کی طرح صبح ہانک کر کارخانے لے جانا۔ اور شام کو چار بجے تالوں میں بند کر دینا۔ ان حالات میں کونسا وقت ہے۔ جب غریب قیدی فٹ بال، والی بال یا کیرم بورڈ کھیل سکتا ہے پھر جو مختصر جیل خانوں میں بند ہے۔ اُسے تو ٹھیک طرح سے ان کھیلوں کے نام بھی نہیں آتے یہ تمام چیزیں جو انجمن جیل آفیسروں کے سپرد کرتی ہے گو دام میں جمع رہتی ہیں۔ کبھی انوار کے دن کسی احاطہ میں۔ ان میں سے ایک آدھ کھیل کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ بھی نہ ہونے کے برابر کیونکہ سب کے سب اناڑی



قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی مشق نہیں ہوتی۔ دن بھر موج کوٹنے اور بان بٹنے والے قیدی فٹ بال یا والی بال کیا جاتیں۔

آج جیلوں میں نصف کے قریب ایسے لاوارث قیدی پڑے ہیں جن کی طرف سے قانون نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ پولیس کا ایک سپاہی اپنی کارگزاری کے لئے۔ راہ چلتے مسافر کو دفعہ ۱۰۹ میں گرفتار کرتا ہے۔

جب وہ عدالت میں لایا جاتا ہے۔ تو کوئی نہیں پوچھتا تیرا ٹھکانہ کہاں ہے تو یہاں کیوں آیا تھا۔ کہاں رہتا ہے۔ لیکن عارضی رہنمائی کے بعد اسے پھر جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ اسی طرح چھ چھ ماہ گزر جاتے ہیں۔ نہ کوئی گواہ ہے نہ کوئی مقدمہ چونکہ پولیس نے اسے گرفتار کیا تھا۔ لہذا وہ جیل میں پڑا ہے۔

گاؤں کے نمبردار کی اگر کسی غریب دیہاتی سے ان بن ہو جائے تو موقع ملتے ہی اس کے سارے خاندان کو جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کی ضمانت تک دینے والا کوئی نہیں ملتا۔

اس قسم کے بسیوڑوں کیس پنجاب کی جیلوں میں مل سکتے ہیں۔ جو امداد کے محتاج ہیں اور صحیح طور پر یہی قیدیوں کی امداد ہے۔

لاوارث حوالاتیوں کے لئے وکیل کی خدمات حاصل کرنا

ہے یہاں ایک آئینی اعتراض ہو سکتا ہے کہ لاوارث ملزمان کیلئے



سرکاری وکیل موجود ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے۔ لیکن موجودہ ماحول میں سرکاری وکیل اور پولیس دونوں کا چوٹی دامن کا ساتھ ہے۔ ان حالات میں بلزم کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اپنا وکیل ہو، ورنہ وہی ہوگا۔ جو منظور..... یہ کار ثواب بھی ہے اور عدالتوں کی امداد بھی۔ انجمن امداد قیدیوں اگر اپنے گزشتہ کارناموں کا محاسبہ کرے۔ تو یقیناً اسے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اس کا موجودہ نظام دولت مند لوگوں کے ہاتھوں میں جا چکا ہے۔ جو سوائے الیکشن لڑنے کے اور کوئی نیک کام کر ہی نہیں سکتے۔ انجمن ہذا اپنے ماضی پر ایک نظر ڈال کر دیکھے۔ کہ جیلوں میں ریڈیو لگانے فٹ بال، والی بال، کیرم بورڈ یا اردو عربی کے قاعدے ہیا کرنے سے قیدیوں میں کس قدر تہذیب آسکی۔ ہر سال کتنے قیدی تعلیم حاصل کر سکے؟

اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہو۔ تو پھر راقم کی رائے میں یہ ڈرامہ ختم کر دینا چاہئے۔ اور اگر واقعی انجمن جیلوں میں کوئی تبدیلی چاہتی ہے۔ تو ان راہوں پر اپنے کو چلانے اور ان تجاویز پر عمل پیرا ہونے سے قیدی اور قانون دونوں فائدے میں رہیں گے۔

۱۔ انجمن امداد قیدیوں اپنے سارے ڈھانچے کو از سر نو منظم کرے۔



۲۔ ہر شہر میں جہاں جیل خانہ ہو۔ مخلص اور یا اثر قومی کارکنوں کی ایک جماعت تیار کی جائے جو لاوارث قیدیوں کے مقدمات کی پیروی کرے جن کی سماعت کو تین ماہ سے زائد عرصہ ہو چکا ہو۔

۳۔ جیل خانوں میں تعلیمی ادارے قائم کرنے میں حکومت سے تعاون کرے۔

۴۔ مستحق قیدیوں کے لئے ایک فنڈ مقرر کیا جائے اس سلسلے میں عوام سے زکوٰۃ، فطرانہ، نذرانہ اور قربانی کی کھالیں جمع کی جائیں۔ (بشرطیکہ حکومت جیل خانوں میں قیدیوں کی اخلاقی تربیت و اصلاح کا کوئی پروگرام تجویز کرے جس سے قیدی ایک بہتر اور اچھا شہری بن سکے)

۵۔ ریڈیو پروگرام میں قیدیوں کے لئے وقت مخصوص کرایا جائے۔

۶۔ قیدیوں کی ملاقات کے وقت انجن ہذا کا آدمی مقرر ہو۔ جو قیدیوں کے ورثا سے درخواستیں وصول کرے۔ تاکہ دور دراز



سے آنے والے وقت اور رشوت سے نجات  
پا سکیں۔

امید ہے۔ میری ان تجاویز پر غور کیا جائے گا۔

---



# نیلی بار

جس طرح لائل پور کا علاقہ ساہنواں بار کہلاتا ہے۔ اسی طرح شگری  
 کے علاقے کو نیلی بار کہتے ہیں..... نیلی بار یہ لفظ پنجاب  
 کی اکثر جلیوں میں سننے اور بولنے میں آتا ہے۔ مگر یہ محاورہ نہیں بلکہ  
 واقعات کی ایک ایسی کڑی ہے جس میں ہر قیدی اپنے آپ کو اسیر  
 دیکھنا چاہتا ہے گر

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اپنے صوبے کی حکومت نے بعض مخصوص قیدیوں کے لئے پورے والا  
 منڈی (ضلع شگری) سے پانچ میل دور ایک آبادی کی بنیاد ڈال رکھی  
 ہے۔ تین ہزار ایکڑ زمین میں سرکاری فارم (ریفارمیٹری) ایسے محرموں



کی لبتی ہے جنہیں قانون نے چند مراعات دے رکھی ہیں۔

اس رعایت کے وہی مستحق ہوتے ہی جو نہ تو قتل کر کے آئے ہوں اور نہ انہیں ارادہ قتل کے تحت سزا ہوئی ہو۔ چور ڈاکو، گروہ کٹ بھی نیلی بار میں آباد نہیں ہو سکتے۔ صرف ایسے مجرم یہاں لائے جاتے ہیں جو معمولی قسم کے جرم میں سزا یافتہ ہوں۔ مثلاً فوجداری یا گھریلو جھگڑے میں الجھ کر جیل آئے ہوں۔ جب قیدی تین سال قید میں سے قریباً اٹھارہ ماہ خوش اسلوبی سے گزار چکا ہو۔ تو اس کا نقشہ جیل سپرنٹنڈنٹ کے ذریعے سے آئی جی (جیل خانہ) سے ہوتا ہوا ہوم سیکرٹری کے پاس جاتا ہے وہاں سے منظوری آنے پر قیدی کو نیلی بار کے افسران کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

بعض اوقات یہ منسل جان پہچان کی وجہ سے فوری طے ہو جاتی ہے ورنہ مہینوں دفاتر کی فائلوں میں محفوظ رہتی ہے۔

نیلی بار کے تمام مستحق قیدی پہلے لائل پور جیل میں جمع کئے جاتے ہیں یہاں سے انہیں متعلقہ حکام اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔

بعض ضرورت مند لوگ اپنے ہاں کام کاج کے لئے محکمہ کو درخواست دیکر معمولی تنخواہ پر قیدی حاصل کر لیتے ہیں جیل کی عام بول چال میں ایسے قیدی اپنے آپ کو نیلی بار میں شمار کرتے ہیں۔

جب پہلی بار قیدی نیلی بار لایا جاتا ہے۔ تو وہاں کے دکاندار (جو



قیدی ہوتے ہیں) اسے بیس روپے قرض کے عوض چار پائی مٹی کا گھڑا - تو -  
 پرات - پتلی - چمچ - کرتہ - پاجامہ دیتے ہیں - اور ٹھننے کے لئے کوئی کپڑا نہیں  
 دیتے خواہ کیسا موسم ہو - اگر قیدی گھر سے خوشحال ہو - تو اپنا انتظام خود کرتا  
 ہے ورنہ حکومت کی طرف سے اسے بیلوں کی جوڑی - ہل - و دیگر کاشت کا  
 سامان دیا جاتا ہے - ہر موسم میں کاشت کی کٹائی پر قبول سابق وزیر چلخانہ  
 جات کے کاشت کار قیدیوں کو چالیس اور ساٹھ کے تناسب سے بٹائی دی  
 جاتی ہے - یعنی پیداوار کا ساٹھ فی صدی قیدی کاشت کار لے جاتے ہیں اور  
 چالیس فی صد حکومت کے پاس رہ جاتا ہے - قیدیوں کے حصے کی فصل فروخت  
 کر دی جاتی ہے - اور روپیہ ان کے نام جمع کر دیا جاتا ہے - جسے وہ رہائی کے  
 وقت وصول کر لیتے ہیں -

جن قیدیوں کے بچے ان کے ہمراہ رہتے ہیں انہیں رہائش کے لئے  
 مکان اور ایک من پانچ سیر غلہ ماہوار ملتا ہے - آج سے کچھ سال پیشتر نئی بار  
 ریفارمیٹری میں کام کرنے والے ہر کاشت کار قیدی کو پچاس روپے ماہوار  
 معاوضہ ملتا تھا جس سے وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے - مگر اب جبکہ  
 ہر شے گراں ہے بیس روپے ماہوار ملتے ہیں - اس فارم سے حکومت کو سال  
 بھر میں قریباً لاکھ روپیہ سے اوپر آمدنی ہوتی ہے  
 نئی بار کا یہ حصہ لفظاً ہر ایک عام گاؤں معلوم ہوتا ہے مگر نہیں - یہ قیدیوں



کی بستی ہے۔ یہاں حکام نے قیدیوں اور ان کے بچوں کے لئے تعلیم کا بہترین  
 انتظام کر رکھا ہے۔ استاد معقول ہے۔ مگر قیدیوں کے رہائشی مکان نہایت  
 گندے ہیں۔ تاہم جیل خانے سے بہتر ہیں۔

یہاں ملاقات کی کوئی پابندی نہیں۔ قیدی معین وقت پر گھر جاسکتا ہے  
 اگر حکومت ذرا سی توجہ اور دے جیسے وزیر جیل خانہ جات نے کہا ہے کہ حکومت  
 اس ریفرمیٹری کو تیس ہزار ایکڑ اراضی سے بڑھا کر مزید چودہ سو ایکڑ کا اضافہ  
 کرنا چاہتی ہے تو یہ رقبہ حکومت اور قیدیوں کے لئے بہترین ثابت  
 ہو سکتا ہے



# میعادی قیدی

غریب کی اولاد اور فوج کا گھوڑا اگر بگڑ جائیں تو عمر بھر درست نہیں ہوتے۔

یوں تو جیل خانوں میں لوگ آتے اور چلے جاتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک دفعہ آکر پھر وہیں کے پورے رہتے ہیں۔

ان بلند دیواروں کے پھوڑے بیٹھے بیٹھے بعضوں کی عمریں گزر چکی ہیں وہ یہاں کی ہر چیز سے مانوس ہو چکے ہیں۔ تہ تو قانون ہی انہیں اجازت دیتا ہے کہ وہ آزاد رہ کر نگہت باد بہاری سے ہمکنار ہو سکیں اور نہ ان کی اپنی عادات اس قابل ہیں کہ موسم فصل گل کا پیام آنے تک ان کے بال و پر درست ہو سکیں۔ ع



بہار اپنی چمن اپنا قفس کی تیلیوں تک ہے

ان کی نگاہیں دور تک جانے کی سعی بہیم میں دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہیں۔ ان کے ہاتھ اٹھتے ہیں۔ تو لوہے کے دروازوں سے چوٹ کھا کر زخمی ہو جاتے ہیں۔ ان کے دماغ سوچتے ہیں تو تالوں کی جھنناہٹ میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ان کے پاؤں حرکت کرتے ہیں تو بوجھل بیڑیاں راستہ روک لیتی ہیں۔ ان کے فکر اور اک کی سمٹی ہوئی دنیا اپنی کوٹھڑی سے آگے نہیں جاسکتی۔ ان کے جسم اس طرح کھوکھلے ہو چکے ہوتے ہیں۔ کہ ہڈیوں کی آواز نبض سے زیادہ تیز سنائی دیتی ہے۔

ان کے سیاہ چہرے اندر دھنسی ہوئی آنکھیں بچکے ہوئے گال دیکھ کر اس طرح محسوس ہوتا جیسے کوئی مردہ اچانک موت کی آنکوش سے گر گیا ہو۔

یہ وہ لاشیں ہیں جن میں جان تو ہے لیکن احساس جان نہیں۔ یہ حرکت تو کرتے ہیں لیکن برکت پیدا کر نہیں سکتے۔ یہ سانس تو لیتے ہیں لیکن برائے نام۔

یہ ہنستے تو ہیں مگر کھوکھلی ہنسی۔

یہ آدمی تو ہیں مگر آدمیت سے دور۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے بگاڑ کی ذمہ داری معاشرے پر نہیں بلکہ والدین

کی غلط تربیت پر عائد ہوتی ہے۔



انہیں جیل کی زبان میں میعادوی قیدی کہا جاتا ہے۔ ان میں قاتل ڈاکو  
چور۔ اور گرہ کٹ عام پائے جاتے ہیں۔

قاتل اگر پھانسی سے بچ جائے تو عمر قیدی ہو کر ان میں شامل ہو جاتا ہے  
ڈاکو مسلسل ڈاکہ زنی کے باعث زندگی کے باقی دن یہیں گزارتا ہے۔  
چور اپنی کارگزاری کی مثل اس قدر بوجھل کر لیتا ہے کہ عدالت میں اسکا  
لئے رحم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

گرہ کٹ۔ ناخن تدبیر سے بار بار دل کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتا  
ہے۔ لیکن ہر بار شکست کھاتا ہے اپنی عادات کے ہاتھوں۔

یہی چار عناصر ہیں جو اس بستی کو کبھی ابڑنے نہیں دیتے۔ ان کے دم سے  
لوہے کے مضبوط تالے۔ بوجھل بیڑیاں ہمیشہ مصروف کار رہتی ہیں۔

۱۹۳۰ء سے قبل ایسے قیدی جن کی سزا بیس سال ہوتی کالے پانی میں بھج  
دیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے طویل المیعاد قیدیوں کو پنجاب کی مختلف  
جیلوں میں رکھا جاتا ہے۔

تقسیم ملک سے ذرا پہلے تک عمر قیدی کو موہ کٹوتی کے چودہ برس کے  
قریب قید کا ٹاپا پڑتی تھی۔ اور بعض قیدی بارہ برس گزار کر رہا ہو جاتے تھے  
لیکن اب یہ رواج نہیں بٹی رسم کے تحت چودہ برس قید کاٹنے کے بعد قید  
کا نقشہ تیار ہوتا ہے اور یہ نقشہ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کی معرفت ہو  
سکرٹری کو بھیجا جاتا ہے۔ وہاں یہ مختلف دفاتر کے چکر کاٹتا ہے۔ ہو



سیکرٹری کے دفتر سے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے پاس، پولیس انسپکٹر کے پاس پھر علاقہ کے انسپکٹر کے پاس اس کے بعد تھانہ محرم کے پاس وہاں سے سپاہی کے ذریعے متعلقہ گاؤں یا علاقہ کے معززین کے پاس جاتا ہے ان کاغذات میں ایک ہی سوال تحقیق طلب ہوتا ہے کہ آیا اس قیدی کے رہا ہونے پر کسی جھگڑے کا پھر سے امکان تو نہیں۔ اگر قیدی کی پشت پناہی کرنے والے اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔ اور متعلقہ افسران کی خدمت کرنے میں نخیل نہیں یا پھر کسی وزیر کی نظر کرم ہو جائے تو قیدی چودہ برس سے ایک دن پیشتر ہی رہا ہو جاتا ہے۔ ورنہ عام طور پر کمزور قیدی کی رپورٹ کمزور ہی ہوتی ہے۔ اکثر ان کاغذات کی آمد و رفت میں سال گزر جاتا ہے۔ اگر افسران متعلقہ کا ارادہ نیک ہو تو یہ سفر مہنتوں اور دلوں میں طے ہو جاتا ہے۔

نئی اطلاع ہے کہ میعاد قیدیوں کے لئے اب یہ حکم آیا ہے۔ کہ بیس سالہ قیدی کم از کم بیس برس ہی گزارے۔ ویسے بھی کاغذ کی آمد و رفت اور ان کی دیکھ بھال میں اسی قدر وقت صرف ہو جاتا ہے۔

حقیقت میں جو رعایت میعاد قیدی کو دے رکھی ہے۔ موجودہ دور

کے حکام قیدی کو اس سے محروم کر رہے ہیں۔

تقسیم ملک سے پیشتر کے حکام قیدی کے حق میں برس نہ تھے۔ سہرمنوہر

لال نے بحیثیت وزیر جیل خانہ حیات حکم دے رکھا تھا کہ بیمار قیدیوں کو ان کی



بقایا قید کے باوجود رہا کر دیا جائے۔ اسی طرح ملک حضرت حیات خان ٹوانہ کے عہد وزارت میں لالہ بصیم سیدین پھرتے جہاں جیل خاتون سے چکی خراس کوٹھو جیسی انسائیت سوڈ سزائیں ختم کیں وہیں میعاد قیدی کو بارہ سال کے بعد رہا کرنے کا حکم دیا۔ نیز ہر چھ ماہ بعد بوڑھے قیدیوں کو رہا کر دیا جاتا تھا۔ پاکستان سے باہر کی حکومتوں نے اور خود پاکستان کے اندر ریاستی حکومتوں نے میعاد قیدی کے لئے بہت کچھ سوچا اور کیا۔ چنانچہ ریاست بہاولپور کی حکومت کے ڈائریکٹر جیل خانہ جات جو گھریلو صنعتوں کے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ ایک منصوبہ تیار کیا ہے کہ

عمر قیدی جنہوں نے اپنی قید میں سے آٹھ برس پورے کر لئے ہوں اور ان کا اس دوران پال چلن اچھا رہا ہو۔ نیز انہوں نے مختلف گھریلو صنعتوں میں خاصی مہارت حاصل کر لی ہو۔ انکو چولستان (بہاولپور) کے علاقہ میں بھیج دیا جائے تاکہ وہاں کی آبادی کو مختلف دست کاریوں میں تربیت دے سکیں اور اس طرح چولستان کی آبادی کا بڑا حصہ جو اس وقت صرف مال مویشی پال کر گزارہ کرتا ہے مختلف دستکاریوں کی بدولت وہاں کی خام اشیاء کام میں لا کر اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکے۔

ریاست بہاولپور نے جولائی ۱۹۵۳ء میں اعلان کیا کہ :-



بنگلور میں ایک کھلا جیل خانہ قائم کیا جائیگا جس کی نہ دیواریں ہونگی اور نہ سلاخیں اس نئے جیل خانہ میں طویل المیعاد قیدیوں کو ان کے اہل و عیال سمیت رہنے کی اجازت ہوگی اور ان پر کوئی محافظ مقرر نہیں کیا جائیگا۔ البتہ اس جیل کے لئے قیدیوں کا انتخاب احتیاط سے کیا جائیگا۔

صرف وہی قیدی اس میں آسکیں گے جو اپنی قید کا پوتھائی حصہ کاٹ چکے ہوں۔ ان قیدیوں کو بگاڑی کے آبپاشی اور پن بجلی کے پروجیکٹ میں کام کرنے کی اجازت ہوگی انہیں عام شرح کے مطابق اجرتیں ملیں گی۔

(حوالہ از آفاق مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۵۳ء)

ریاست حیدرآباد نے سکندرآباد سے اعلان کیا :-

ریاست حیدرآباد نے میعاد قیدیوں کی اصلاح کا کام شروع کر رکھا ہے چنانچہ سنٹرل جیل کے دو سو بیس قیدیوں میں سے ایک سو ننانوے قیدیوں نے مختلف زبانوں کے امتحان دیکر کامیابی حاصل کی۔

(امروزہ ۲۷ اپریل ۱۹۵۳ء)

پھر ایک سال بعد بھارت حکومت نے اعلان کیا :-



حیدرآباد سنٹرل جیل میں عمر قید سزا کاٹنے والے دو کمیونسٹ قیدیوں  
کو یونیورسٹی کے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دے دی ہے  
ان میں سے ایک قیدی کو اولاً سزائے موت دی گئی تھی جس کو  
بعد میں عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔

(امروز ۲۹ دسمبر ۱۹۵۲ء)

جہاں تک پنجاب کے جیل خانوں کے اندر روئی نظام کا تعلق ہے میعاد  
قیدیوں کے لئے صوبائی حکومت کے پاس سوائے روپیہ اور ان کی عمر  
صانع کرنے کے اور کوئی انتظام نہیں اس کے باوجود حکام ایسے مجرموں کو  
ان کی قید میں اضافہ کر کے کسی تدبیر کا ثبوت نہیں دے رہے بلکہ جیل خانوں  
میں پرورش پانے والے مجرموں کی عمر بڑھا رہے ہیں۔

امید ہے کہ آج نہیں تو کل حکومت کو اپنے اس فیصلہ پر نظر ثانی  
کرنا پڑے گی۔



# جیل سے فراری

جیل خالوں سے قیدیوں کے فرار کے متعلق جب کسی اخبار میں خبر شائع ہوتی ہے تو عوام سوچتے ہیں کہ اٹھارہ انیس فٹ اونچی دیوار۔ لوہے کے دروازے۔ پولیس کا انتظام۔ پھر دن میں تین بار قیدیوں کی گنتی کے باوجود یہ فرار کیسے ہو جاتے ہیں یہ سوال اپنی جگہ ایک وزن رکھتا ہے۔ مگر یہ سوچئے کہ دیکھ بھال کرنے والے بھی آدمی ہیں۔ اور اس نظام سے بغاوت کرنے والے بھی آدمی۔

مختلف دماغ مختلف طریقوں سے سوچتے ہیں۔ ایک اگر گرہ باندھنے کی فکر میں ہے تو دوسرا گرہ کھولنے کی فکر میں شب اور روز کھویا رہتا ہے۔ لگاڑنے اور ستوارنے کے دونوں راستے ساتھ ساتھ برابر چل رہے ہیں اور چونکہ



فطرتِ انسانی قناعت نہیں کر سکتی۔ ہر آدمی اپنے لئے نئی جگہ تلاش کرتا ہے۔  
نئے ٹھکانے ڈھونڈتا ہے۔

جیل خانہ پابندی کا دوسرا نام ہے۔ آزاد منش انسان اس پابندی  
کو کیونکہ گوارہ کر سکتا ہے اگر وقت کا قانون اس کی کبھی حرکت کے خلاف حرکت  
کرتا ہے۔ تو وہ اس سے رہائی کے لئے پروں سوچتا رہتا ہے۔ چنانچہ  
جیل خانوں سے فراری کے واقعات کے محرک ایسے ہی خیالات ہوتے  
ہیں ایسے ارادوں کی تکمیل کے لئے کبھی تو انسان اکیلا سوچتا ہے اور کبھی  
اس کے ہم جلیس اس کی معاونت کرتے ہیں۔ رہا سامان تو ضرورت اپنا  
سامان خود ایجاد کرتی ہے۔

جیل خانوں سے قیدی کا فرار کبھی تو حکام جیل کی غفلت سے ہوتا  
ہے اور کبھی قیدی کو آزاد فضا کے پیغام آنے لگتے ہیں۔ اور وہ رخصتِ سفر  
باندھتا ہے۔

۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ لائل پور جیل سے ۲۶ اور ۲۷ جولائی کی  
درمیانی رات کو چار آدمی کورٹ موقع سے فرار ہوتے ہیں کلبیاہ  
ہو گئے۔

چاند رات کا پھلا پہنچا کہ اچانک ہنگامہ ہوا وہ مار گئے.....  
تیری ماں کی تیری بہن کی، یہ گئے..... وہ گئے۔ اس دھینگا



مُشتی سے تمام جیل میں ہراس پھیل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پتہ چلا کہ فلاں فلاں قیدی بھاگ نکلے میں کامیاب ہو گئے ہو ایہ کہ ۲۶ جولائی کو اتوار کی صبح تھی اور قریب کے احاطے میں حوالاتی آپس میں کشتی کا پروگرام بنا رہے تھے۔ فرار ہونے والے قیدیوں نے اپنے احاطہ کے انچارج سے وہاں تک جانے کی اجازت چاہی لیکن پاس نے انکار کر دیا۔ یہ بہانہ بنا فرار ہونے کا۔

جس جگہ یہ قیدی رات کو بند ہوتے تھے ان کو ٹھٹھریوں کے مقابل چند ایسی کوٹھڑیاں تھیں جو بیکار ہونے کی وجہ سے خشک سبزیوں کا گودام بن گئیں تھیں۔ موقع پا کر ان کو ٹھٹھریوں کے دونوں تختے اکھاڑ کر انہیں آپس میں باندھ کر سیڑھی کی صورت دیکر محفوظ کر لیا نیز اسی دن سر شام کسی طرح چابیوں کے گچھے سے اصل چابیاں نکال کر اس میں نقلی چابیاں ڈال دیں تاکہ گنتی برابر رہے۔ وقت آنے پر ایک قیدی جس کے پاس کدال کی سی قسم کا ایک ہتھیار تھا۔ اپنی کوٹھڑی کے اندر سے نکتب لگا کر باہر نکلا اور پھر اس نے چابی سے اپنے تین ساتھیوں کو رہا کیا۔ ان سب نے مل کر گودام سے وہی سیڑھی نکالی پہلے اپنا احاطہ پار کیا پھر کورٹ موقع اور بھاگ نکلے!



بہت برسوں کی بات ہے کہ :-

منگمری جیل سے چودہ قیدیوں نے مل کر فرار ہونے کی کوشش میں ایک کوٹھڑی سے سرنگ لگانی شروع کی۔ جیل کا بھنگی اس سازش میں ان کا شریک کار تھا۔ وہ دن بھر کی مٹی ٹھکانے لگانا رہتا۔ اس کوشش میں قیدی کورٹ موقعہ کی دیوار تک چلے گئے۔ ایک رات جب وہ سرنگ کے ذریعے باہر نکل رہے تھے بدقسمتی سے پولیس گشت کرتی ہوئی ادھر آنکلی۔ اور قیدیوں کی تمام محنت رائیگاں گئی وہ پھر سے اپنی جگہ واپس لائے گئے۔

پشاور جیل میں بھی ایسا ہی ہوا۔

بعض جیلوں میں میعادی قیدیوں کے لئے خیمے نصب کئے جاتے ہیں یہ خیمے دن بھر خالی رہتے ہیں۔ رات کو ان قیدیوں کی گشتی انہی خیموں میں ہوتی ہے۔ پشاور جیل میں بھی خیمے نصب تھے کہ ایک بھنگی قیدی نے اپنی نجات کا طریقہ خالی کیمپ کے ذریعے سوچا۔ چنانچہ ایک کیمپ میں سرنگ لگانی شروع کی۔ ابھی وہ کورٹ موقعہ سے دور ہی تھا کہ ایک قیدی نے اسے یہ حرکت



کرتے دیکھ لیا۔ یہ راز فاش ہونے پر قیدی کو پھر سے مقفل  
کر دیا گیا۔

اپنے دلش ہی میں نہیں پرانے دلش میں بھی ایسا ہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔  
سوئڈن جیل سے ایک قیدی کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب  
ہو گیا۔ پولیس تعاقب کر رہی تھی۔ کہ وہ ریڈی میڈ (READY  
MAID) کپڑوں کی دوکان میں گھس گیا اور  
جلدی سے دکان سے نمونہ کے کپڑے پہن کر نمائشی محبموں کے  
ساتھ بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ اس طرح اس کا خیال تھا کہ وہ  
پولیس کو چکمہ دے سکے گا۔ لیکن اس کے ناک پر مکھی بیٹھنے سے سارے  
بھانڈا چھوٹ گیا۔ جیسے ہی اس نے مکھی کو اڑانے کے لئے ہاتھ  
اٹھایا پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔

۵

۱۹۳۹ء کے آخری مہینوں کی بات ہے :-

امرت سر جیل قیدیوں کی تعداد سے ہمیشہ تنگ رہتی تھی۔  
موسم سرما کی ایک شام کا ذکر ہے کہ تمام حوالاتی اپنے اپنے گروہ  
بنائے ٹہل رہے تھے۔ گنتی کا وقت قریب ہو رہا تھا۔ کہ اچانک  
پٹاخے کی آواز سے تمام جیل متحرک ہو گیا۔ تھوڑی سی دیر بعد شور مچا



کہ جیل کی گنتی پوری نہیں ہو رہی۔ پھر سے تمام قیدیوں کا شمار ہوا۔  
مگر کمی برابر ہونے میں نہ آئی تین آدمی کم ہو رہے تھے یہاں تک کہ شام  
رات میں تبدیل ہو گئی۔

ڈاکوؤں کا ایک گروہ جس کے تین آدمی پولیس گرفتار کر چکی تھی  
اپنے ساتھیوں کو جیل سے چھڑا لینے میں کامیاب ہو گئے۔  
بھاگنے سے کچھ دیر پہلے وہ اپنے گروہ سے ملاقات کر چکے تھے۔  
لوہے کی ایک موٹی سلاح نے ان کا ساتھ دیا جب دیوار سے  
رستہ باندھ کر پری طرف پھینکا گیا تو یہ سلاح اس سے باندھ  
دی گئی تینوں ڈاکو ایک دوسرے کا سہارا لے کر سلاح اور  
رستہ کے ساتھ چمٹ گئے۔ باہر کے گروہ نے رستہ کھینچا۔ گھوٹے  
تیار کھڑے تھے۔ سوار ہو کر بھاگنے سے پہلے ایک پٹانہ چھوڑ گئے  
یہ ان دوستوں کی اطلاع کے لئے تھا جنہوں نے انہیں بھاگنے  
میں مدد دی تھی۔

۴

اگست ۱۹۵۳ء کے پہلے ہفتہ میں لائل پور جیل سے :-  
مرمت پنچہ میں ایک قیدی کام کر رہا تھا۔ نہ جانے اسے کیا خیال  
آیا کہ قیدیوں کے لباس میں محافظ کی آنکھ بچا کر بھاگ نکلا تیسرے



دن یہ قیدی اپنے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ جب اس سے سوال کیا گیا کہ تجھے بیٹھے بھائے یہ کیا مذاق سوچا تو وہ مسکرایا اور اس نے ایک بیان دیا لیکن وہ کاغذ چاڑھ دیا گیا اور اس کی جگہ ایک نیا بیان تجویز کیا گیا۔ کہ میرا گھر جانکو جی چاہتا تھا میں چلا گیا۔

جیل سے فرار کی سزا مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ دیوار پھاند کر جانے والے کو الگ سزا ملتی ہے باہر پنجرے سے بھاگنے والے قیدی کو الگ سزا دی جاتی ہے، ڈیوڑھی سے بھاگنے کی کوشش میں اور قسم کی سزا ہوتی ہے یہ سزائیں دو ماہ سے لیکر تھپہ ماہ تک ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ایسے قیدیوں کے مقدمے عدالت میں بھیجے جاتے ہیں اور بعض دفعہ جیل حکام خود ہی فیصلہ کرتے ہیں۔



# جیل اور رشوت

حکومت کی دیکھ بھال کے باوجود رشوت ہمارے ملک میں ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ اس بیماری میں ہر محکمہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی انتہائی کوششوں میں مصروف ہے۔

جیل خانہ ایک ایسا محکمہ ہے جس کی رشوت نہ بند ہو سکتی ہے اور نہ پکڑی جاسکتی ہے حالانکہ اس رشوت کے گواہ ہوتے ہیں لیکن وقت پر گواہ ہی سلطانی گواہ بن کر اٹھار کر دیتا ہے۔ اس گواہی سے قیدی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے اس کی تمام قیدانہوں کے ظلم کا نشانہ بن جاتی ہے۔

یوں تو جیل خانے میں رشوت کے بیسیوں طریقے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے ہی جن کا آغاز قیدی کے جیل میں داخلے کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔



کہ جیل کی گنتی پوری نہیں ہو رہی۔ پھر سے تمام قیدیوں کا شمار ہوا۔  
مگر کمی برابر ہونے میں نہ آئی تین آدمی کم ہو رہے تھے یہاں تک کہ شام  
رات میں تبدیل ہو گئی۔

ڈاکوؤں کا ایک گروہ جس کے تین آدمی پولیس گرفتار کر چکی تھی  
اپنے ساتھیوں کو جیل سے چھڑا لینے میں کامیاب ہو گئے۔  
بھاگنے سے کچھ دیر پہلے وہ اپنے گروہ سے ملاقات کر چکے تھے۔  
لوہے کی ایک موٹی سلاح نے ان کا ساتھ دیا جب دیوار سے  
رستہ باندھ کر پر پی طرف پھینکا گیا تو یہ سلاح اس سے باندھ  
دی گئی تینوں ڈاکو ایک دوسرے کا سہارا لے کر سلاح اور  
رستہ کے ساتھ چمٹ گئے۔ باہر کے گروہ نے رستہ کھینچا۔ گھوٹے  
تیار کھڑے تھے۔ سوار ہو کر بھاگنے سے پہلے ایک پٹا تہ چھوڑ گئے  
یہ ان دوستوں کی اطلاع کے لئے تھا جنہوں نے انہیں بھاگنے  
میں مدد دی تھی۔

۴

اگست ۱۹۵۳ء کے پہلے ہفتہ میں لائل پور جیل سے :-  
مرمت پنچہ میں ایک قیدی کام کر رہا تھا۔ نہ جانے اسے کیا خیال  
آیا کہ قیدیوں کے لباس میں محافظ کی آنکھ بچا کر بھاگ نکلا تیسرے



دن یہ قیدی اپنے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ جب اس سے سوال کیا گیا کہ تجھے بیٹھے بچھائے یہ کیا مذاق سوچا تو وہ مسکرایا اور اس نے ایک بیان دیا لیکن وہ کاغذ چھڑ دیا گیا اور اس کی جگہ ایک نیا بیان تجویز کیا گیا۔ کہ میرا گھر جانکو جی چاہتا تھا میں چلا گیا۔

جیل سے فرار کی سزا مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ دیوار پھاند کر جانے والے کو الگ سزا ملتی ہے باہر پہنچے سے بھاگنے والے قیدی کو الگ سزا دی جاتی ہے ڈیوڑھی سے بھاگنے کی کوشش میں اور قسم کی سزا ہوتی ہے یہ سزائیں دو ماہ سے لیکر پچھ ماہ تک ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ایسے قیدیوں کے مقدمے عدالت میں بھیجے جاتے ہیں اور بعض دفعہ جیل حکام خود ہی فیصلہ کرتے ہیں۔



# جیل اور رشوت

حکومت کی دیگر مجال کے باوجود رشوت ہمارے ملک میں ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ اس بیماری میں ہر محکمہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی انتہائی کوششوں میں مصروف ہے۔

جیل خانہ ایک ایسا محکمہ ہے جس کی رشوت نہ بند ہو سکتی ہے اور نہ پکڑی جاسکتی ہے حالانکہ اس رشوت کے گواہ ہوتے ہیں لیکن وقت پر گواہ ہی سلطانی گواہ بن کر اٹھا کر دیتا ہے۔ اس گواہی سے قیدی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے اس کی تمام قیدانہوں کے ظلم کا نشانہ بن جاتی ہے۔

یوں تو جیل خانے میں رشوت کے بیسیوں طریقے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے ہیں جن کا آغاز قیدی کے جیل میں داخلے کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔



قیدی کو دس دن تنہائی کو ٹھٹھری میں رکھنا ضروری ہوتا ہے دنیا سے  
 مانوس آدمی کو جیل کے خوف و ہراس میں۔ تنہائی میں بند کرنا اس کے  
 حواس کھو دیتا ہے پھر وہ سہارے تلاش کرتا ہے اسے حواس یا نختہ  
 دیکھنے پر دار یا ملازم اس کے گرد چکر کاٹنا شروع کرتے ہیں قیدی اپنی  
 نجات کے لئے دونوں سے گفتگو کرتا ہے۔ آخر زبرداری، ملازم کو قیدی  
 کی امداد پر مجبور کرتا ہے۔ چنانچہ

قیدی کسی نہ کسی طرح جو رقم اپنے ساتھ اللہ سے آیا تھا وہ بھینٹ  
 پڑھائی جاتی ہے۔ تب اسے عارضی رہائی نصیب ہوتی ہے۔

اس سے یہ ہوتا ہے کہ قیدی سارا دن کو ٹھٹھری میں بند رہنے کی  
 بجائے ہمہ اوقات کھل رہتا ہے۔ اگر کسی آفیسر کے آنے کی اطلاع مل جائے  
 تو اسے بند کر دیا جاتا اور نہ پہلے دن وہ اپنی کو ٹھٹھری کے سامنے۔  
 دوسرے دن ذرا دور آہستہ آہستہ وہ اپنے احاطہ میں گھومتا پھرتا ہے۔

دس دن کے بعد قیدی کو شقت کے لئے جب ڈاکٹر اور سپرنٹنڈنٹ کے  
 روبرو لایا جاتا ہے اس کی صحت کے مطابق شقت تجویز کی جاتی ہے  
 پہلے دن قیدی شقت کے لئے کارخانے پختا ہے تو دس سیزونج



کا گٹھڑو دیکھ کر اس کے حواس گم ہو جاتے ہیں قیدی مونی کوٹنے کا  
 عادی نہیں مگر قانون کا کہناب ہے کہ یہ مشقت شام تک پوری کرو۔  
 آخر نمبردار سے بات ہوتی ہے وہ ملازم سے بات طے کرتا ہے قیدی  
 اپنے ورثا کو خط بھی ملازم کی نگہ سے خرید کر تحریر کرتا ہے قیدی  
 صرف اپنا پتہ بتا دیتا ہے قیدی کے وارث ملاقات پر آتے ہیں تو  
 ملازم موقع پر موجود ہوتا ہے آٹنے سامنے بات ہوتی ہے بس پھر قیدی  
 دن بھر آزاد ہوتا ہے۔ اس کی مشقت کسی لاوارث قیدی کے سپرد  
 ہو جاتی ہے۔ اس بات چیت میں ملازم اور نمبردار برابر کے شریک ہوتے ہیں

۳

عموماً پنجاب کے دیہات میں تو فسادات ہوتے ہیں اس میں بڑے  
 زمینداروں کا ہاتھ کام کر رہا ہوتا ہے۔ جب یہ لوگ جیل جلتے ہیں  
 تو ان کی پشت پناہی ایسے ہی لوگ کرتے ہیں۔ جو ہزاروں میل لمبی  
 اراضی کے مالک ہوتے ہیں اگر ان کے مقدمات ہر ہزاروں اور لاکھوں  
 کی رقم صرف ہوتی ہے تو دوسری طرف اپنے قیدیوں سے بھی غافل نہیں  
 ہوتے۔ چنانچہ یہ زمینداروں کے مقدمات کے طریقے سوچے جاتے ہیں۔  
 یہی ملاقات ہی کام کر جاتی ہے۔

زمیندار گھر سے ایک بھینس اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب کی کوٹھی پر لا کر



باندھ دی جائے تو اس میں ترحم ہی کیا ہے دو چار کنستریگی کے اگر سپرنٹنڈنٹس کے بچوں کے لئے بھیج دیئے جائیں تو زمیندار کے ہاں کونسی کمی واقع ہو جائیگی بیس پچیس من گندم تو معمولی بات ہے۔ ایسے قیدی عام طور پر سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے اردلی مقرر ہوتے ہیں۔ ع

سیال بھئے کو تو ال اب ڈر کا ہے کا  
یہ لوگ جیل خالوں میں سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں۔

۴

قیدی کی ملاقات کے لئے وقت مقرر ہے مگر دور سے آنے والا اگر وقت پر نہیں آتا تو اسے دوسرے دن کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔  
مجھ وار لوگ ایسے وقت دریاں سے ملاقات کر لیتے ہیں۔  
ملاقات سے پہلے ڈیوڑھی کے منبردار سے بات طے کرنا پڑتی ہے۔  
خیر ملاقات تو ہو ہی جاتی ہے لیکن اٹنڈہ کے لئے دور سے آنے والا مسافر اپنے زادراہ میں اضافہ کر کے گھر سے چلتا ہے۔

۵

جیل خانے میں بعض ایسی مشقیں ہیں جن کے لئے قیدی آفیسروں کی ہر خواہش پر دم دیتا ہے مثلاً غلہ گو دام..... لنگر..... ڈیوڑھی



ہسپتال.....

یہ وہ جگہیں ہیں جہاں قیدی کو آرام بھی ملتا ہے اور دام بھی۔ لیکن  
یہاں تک پہنچنے کے لئے قیدی کو بڑی ٹیڑھی راہوں سے گزرنا پڑتا  
ہے۔ ایسے موقع پر اگر قیدی کو باہر سے ملک پہنچ جائے تو بہتر ورنہ  
اندر سے انتظام کرتے پڑتے ہیں یہ کیا؟

اس کا جواب کسی دوسرے عنوان کے تحت دیکھیے

یہ افسانے نہیں کہ تراشے گئے ہوں بلکہ واقعات اور مشاہدات ہیں جو آئے دن جیل  
خاتوں میں پیش آتے رہتے ہیں۔ اب کہئے ع

ایسی چوری کا پتہ خاک لگائے کوئی



# جیل اور دکانداری

وزیر جیل خانہ کے پارلیمانی سیکرٹری نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ،  
ایوان کو بتایا کہ :-

بعض جیلوں میں بھی دکانوں کا انتظام کیا گیا ہے جہاں سے قیدی  
اپنی ضرورت کی اشیاء خرید سکتے ہیں۔

(آفاق ۲۔ اپریل ۱۹۵۵ء)

اس کا طریقہ یہ ہے کہ قیدی کے وارث کچھ رقم قیدی کے نام جیل آفیسروں کے پاس  
جمع کر دیتے ہیں جیل حکام نے دو آنے۔ چار آنے۔ آٹھ آنے۔ ایک روپیہ کی  
پرچیاں چھاپ رکھی ہیں۔ یہ پرچیاں ان قیدیوں میں تقسیم کر دی جاتی ہیں جن  
کی رقم جمع ہوتی ہے۔ بوقت ضرورت قیدی دکاندار کو یہ پرچی دے کر حسب ضرورت



اشیاء خریدتی ہے۔

یہ انتظام قابل تعریف ہے لیکن ابھی عام نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی ایسی چیز ہے جو قیدی خرید سکتا ہے ؟

وزیر جیل خانہ کے پارلیمانی سیکرٹری کو شاید علم نہ ہو کہ جیل خانوں میں پہلے بھی دکانیں تھیں قیدی کو اس کی ضرورت کی چیزیں پہلے ہی میسر آتی تھیں اور آج بھی وہ ہیں۔ چرس۔ افیون۔ بھنگ۔ سگریٹ اور چرس اکثر قیدی گمی اور گمر کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں مگر چرس اور افیون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے یہ ہیں قیدی کی ضرورت کی چیزیں اور یہ اشیاء جیل خانوں میں ابی چار ٹھکانوں سے عام مل سکتی ہیں۔

دھوبی خانہ (یہ کھاتہ بظاہر قیدیوں کے کپڑے دھونے کے لئے ہے لیکن انہیں جیل حکام کے کپڑے دھونے سے ہی فرصت نہیں ہوتی)

لنگر..... ہسپتال..... غلہ گودام

ان جگہوں پر آفیسر اور ٹاکم آتے ہیں۔ اور انہیں بھی تو ان جگہوں کی تلاش نہیں ہوتی اگر تلاش ہو بھی تو یہاں بناہ گاہیں کافی ہوتی ہیں۔

ان چیزوں کے فروخت کرے اور یا ہر سے ہیا کرنے میں قیدی کا ہاتھ پھین فیصد ہوتا ہے افیون اگر باہر پانچ روپے تولہ فروخت ہوتی ہے تو جیل خانے میں نور روپے تولہ بڑی آسانی سے مل سکتی ہے چرس بھی اسی حساب سے۔



سگرٹ کی ڈبیا اگر باہر چارہ آنے میں مل سکتی ہے تو یہاں کے وکاندار چھ آنے  
میں فروخت کرتے ہیں۔

اس سے میری مراد یہ نہیں کہ حکومت قیدیوں کو ایسی چیزیں بھیجا کرے  
بلکہ میں نے نشاندہی کی ہے تاکہ ان کا انداز ہو سکے۔



# جیل و عبادت

انسان کے لئے خدا کی عبادت اسی طرح لازمی ہے جس طرح زندہ رہنے کے لئے سانس۔ مگر انسان اس حقوق کو مہیبت کے وقت پورا کرتا ہے حالانکہ بے غرض عبادت انسانی زندگی کا خوبصورت زیور ہے۔

جس قدر عبادت جیل خالوں میں ہوتی ہے اگر اس کا ایک تہائی حصہ بغیر غرض کے ہو تو ایسی تمام زنجیریں کٹ جائیں جن میں آج بنی نوع انسان گرفتار ہے۔ مگر اس عبادت میں غرض اور ریاکاری پیش پیش ہوتی ہے اس لئے جیل خانے کا عبادت قیدی کو نہ ماضی کے گناہ سے نجات دے سکتی ہے اور نہ اس کے مستقبل کے لئے کارآمد ہوتی ہے۔

حوالاتی ہو یا قیدی جیل خانے میں داخل ہوتے ہی گھر والوں کو



قرآن کریم اور تسبیح مہیا کرنے کی تاکید کرتا ہے گلاب سنگھ کے چھاپے خانے  
 کا قرآن مجید اور لکڑی کی تسبیح جیل خانے میں قیدی کا زیور ہوتے ہیں۔  
 موت کی سزا ہو تو قرآن مجید تسبیح اور نماز بیک وقت حرکت میں آتے  
 ہیں ورنہ صبح قرآن مجید اور تسبیح دن بھر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ مگر اپیل تک  
 اپیل اگر منظور ہو جائے تو گھر والوں کو داؤ ملتی ہے۔ وکیل کی تعریف ہوتی ہے  
 اگر نامنظور ہو تو خدات گلا اور شکایت اور یہ کہہ کر کہ خدا کو یہی منظور تھا۔  
 تسبیح نماز قرآن کریم تینوں گلدستہ طاق نسیان بن جاتے ہیں اور پھر یہ تینوں قیدی  
 کامنہ تکتے رہتے ہیں۔



# سیاسی قیدی

اختلاف مزاج میں ہو یا رائے میں دونوں طرح سے برسرِ اقتدار طبقہ کیلئے غیر مفید ہوتا ہے۔ اور ان دونوں میں ہمیشہ سے جنگ رہی ہے۔ اگر مزاج کسی طرح معیوب ہو کر نظام حکومت کے تابع ہو گیا ہے تو رائے نے اپنے لئے الگ پناہ ڈھونڈ لی ہے اگر رائے حکومت میں برابر کی شریک ہے تو مزاج نے برہم ہو کر بغاوت کی آگ و امن دل سے ہوا دینا شروع کر دی۔

نہ صرف انسانی وجود بلکہ کائنات کا نظام بھی مزاج اور رائے دونوں ستونوں پر قائم ہے۔ ان میں اگر یکسانیت نہ ہو تو یہ گاڑھی دو قدم نہیں چل سکتی۔ اسی طرح راعی اور رعایا کے درمیان علیحہ حاصل ہوتی ہے۔ اگر رعایا کی رائے راجہ کے مزاج سے ٹکراتی ہو تو ملک کا امن بغاوت کی آگ میں جل کر رکھ ہو



جائے گا۔ بس یہیں سے سیاسی ذہنوں کی پرورش شروع ہوتی ہے۔ اور دونوں  
کے راستے جدا جدا ہو جاتے ہیں۔

حکومت پارٹی کی ہو یا شخصی اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سیاسی  
قیدی ایک غیر معمولی حیثیت کا مالک ہوتا ہے گو قیدی کے وقار سے وقار سلطنت  
کو ایذا پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے تاہم اس پر تشدد سے نہ قیدی کا وقار کم ہوتا ہے  
نہ وقار سلطنت ہی بچ سکتا ہے۔

انگریز کی غلامداری میں پاک و ہند کی آزادی کے لئے جس قدر سیاسی  
لڑائیاں لڑی گئیں ان میں تشدد کی لڑائیاں ہوں یا نہیں سب گہرے سب کیلئے  
جیل خانے آباد کرنے پڑے اگر ایسے لوگ باغی کہلاتے تو بھی بڑی بات تھی حالانکہ  
اپنے وطن کے لئے لڑنے والے باغی نہیں ہو سکتے لیکن غیر ملکی حکمرانوں نے ایک  
مدت تک ایسے لوگوں کو چور اور ڈاکوؤں میں شمار کیا۔ جیل خانوں کی تاریخ شاہد ہے  
کہ محب وطن قیدیوں کے ساتھ انگریزی قانون نے آپے سے باہر ہو کر جو سلوک  
کیا آج بھی ڈم ڈم (کلکتہ) سے لے کر شاپور تک کے جیل خانے کی دیواریں  
ان سے لرزہ برانداز ہیں۔

برطانوی سیاست دانوں نے متحدہ ہندوستان کے پولیٹیکل قیدیوں سے بھنگیوں  
کا کام لینا بھی ان کی عزت خیال کیا۔

تاریخ کا یہ بھی ایک حصہ ہے کہ اگر کوئی انگریز شراب نوشی یا زنا میں گرفتار



ہو کر جیل میں آیا ہے تو اس کے لئے یورپین وارڈ میں کھن ٹوس چائے انڈے ڈیل روٹی کا باقاعدہ انتظام ہوتا تھا۔ یہ وارڈ ہنوز پنجاب کی جیلوں میں موجود ہیں۔ اور اس کے مقابل مولینا حسرت موہانی، گنگا دھر مال تلک۔ بابا خضر محمد غاندھی۔ مولانا رشید احمد کنگڑی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ بابا گوردت سنگھ ایسے رہنمایان وطن کو کوئیں میں اٹھا لٹکایا جاتا تھا۔ پاؤں میں بٹیریاں اور ہاتھوں میں تھکڑیاں ڈال کر دن بھر گرمی کے موسم میں دھوپ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ چنوں کی روٹی گھاس پھوس کے ساتھ دی جاتی تھی۔ یہی خوراک اس زمانہ میں عام اخلاقی قیدیوں کی تھی۔

ہاتما گاندھی پاک و ہند کی جیلوں کی تاریخ میں پہلے سیاسی قیدی ہیں جنہیں عام قیدیوں سے ہٹ کر قدرے بہتر خوراک دی گئی۔

۱۹۱۹ء کے بعد پنجاب کی جیلوں میں سیاسی قیدیوں کے لئے سپیشل کلاس مقرر ہوئی۔ چنانچہ خلافت اور ترک موالات کے مشترک سیاسی قیدیوں کو ان دونوں میاں والی جیل میں حسب ذیل خوراک دی جاتی تھی۔

- |                |            |
|----------------|------------|
| ۱۔ گھی         | ایک چھٹانک |
| ۲۔ چینی        | ایک "      |
| ۳۔ چائے کی پتی | ۱/۸ "      |
| ۴۔ گوشت        | پاؤ بھر    |



۵۔ گوشت کی جگہ انڈے یا دہی دودھ بھی لے سکتے تھے ان کے علاوہ آٹا  
 لکڑی مرچ نمک اور دوسری چیزیں۔ یہ خوراک اس زمانے میں تقریباً ۹ کی بنتی  
 تھی جبکہ عام قیدیوں کی خوراک ایک آنہ چھ پائی تھی۔ مگر یاد رہے اس خوراک کے مستحق  
 عام سیاسی قیدی نہیں تھے بلکہ تین قسم کے گروہ مقرر تھے۔ اول وہ جو ٹیکس گزار تھے۔  
 دوئم گریجویٹ آخری درجہ ان لوگوں کا تھا جنہیں پبلک پوزیشن حاصل تھی  
 ظاہر ہے کہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء کے زمانہ میں پاک و ہند کے بہت کم لوگ اس  
 درجہ کے تھے چنانچہ اس امتیازی حیثیت کے قیدیوں کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جاسکتی  
 تھی لیکن اس کلاس سے یہ ضرور ہوا کہ جیلوں میں قیدیوں کی ایک نئی قسم نظر آنے  
 لگی اور یہ سلسلہ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۸ء تک رہا۔

انہیں برسوں میں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی لاہور لورٹل اور سنٹرل  
 جیل میں مقید تھے۔ انہوں نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف یعنی جیل خانوں میں  
 سیاسی قیدیوں کے درمیان امتیاز کے خلاف احتجاجاً بھوک ہڑتال شروع کی تاکہ  
 تمام سیاسی قیدیوں کو بہتر کلاس میں رکھا جائے۔ اس جلد و جہد میں کافی نوجوانوں  
 کی صحتیں برباد ہوئیں اور بنگال کا ایک نوجوان جتندر ناتھ داس ۱۹۲۸ء کی بھوک  
 ہڑتال سے لورٹل جیل میں فوت ہو گیا۔ اس قربانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی طرف  
 سے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں غیر سرکاری ممبر چوہدری افضل حق مرحوم مولانا مظہر  
 علی ناظم اور سر منوہر لال بھی شامل تھے۔ گو یہ کمیٹی قیدیوں کے لئے کچھ کر نہ سکی۔



تاہم ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے سلسلہ میں جیل لوگ جیلوں میں گئے تو سیاسی قیدیوں کو تین کلاسوں میں منقسم پایا۔

۱۔ اے کلاس - اس کلاس کے قیدی اسی خوراک کے مستحق تھے جو گزشتہ برس میانوالی جیل میں ملتی رہی البتہ یہ قیدی ذاتی طور پر دو صد روپیہ ماہوار تک خرچ کر سکتے تھے۔ یہ رقم جیل کی خوراک کے علاوہ ہوتی تھی۔

۲۔ بی کلاس تھی۔ اس کی خوراک اور اول اند کی خوراک میں کوئی فرق نہیں تھا مگر اس کلاس کے قیدی ضروریات کی کوئی چیز باہر سے نہیں منگوا سکتے تھے۔

۳۔ تیسرے وہی نام قیدیوں کی کلاس تھی جس میں ایک آنہ چھ پائی کی خوراک دی جاتی تھی اگرچہ اس تفریق کے باعث پنجاب کی جیلوں میں وقتی طور پر انتشار پھیل گیا لیکن حکومت نے اے اور بی کلاس کے قیدیوں کو نو سنٹرل جیل ملتان اور نیوڈسٹرکٹ جیل گجرات میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا لہذا اس سنگلامہ کی عمر بہت کم نکلی۔

سی کلاس کے سیاسی قیدیوں سے وہی سلوک ہوتا تھا جو چوروں ڈاکوؤں سے یعنی ہلکی پسینا کو لہو چلانا موچھ کو طہا یاں بٹنا کھڑا چلانا۔ جگانی اور سرخی کو سنا وغیرہ ہم مشقتیں لے جاتی تھیں لباس اور خوراک میں بھی کوئی امتیاز نہ تھا۔

کسی تحریک کے علاوہ الرہنی سیاسی کارکن مقدمہ میں چلا جاتا تھا تو حکام جیل اس قدر زبرد و اسلوک کرتے کہ شاہد ہی کسی سنگین مجرم سے ایسا سلوک جیل میں ہوا ہو۔



سیاسی قیدیوں پر گزشتہ ایک صدی سے جو تشدد جیل کی چار دیواری میں ہوا تاریخ کے ابواب اس سے قطعاً خبر نہیں جیل خانے کے قانون نے جی بھر کہ ان پر جو حملہ آرمایا کرٹی سے کرٹی مشقت۔ ظالم سے ظالم سزا اور بڑے سے بڑا عذاب اس جہنم کردہ میں وطن عزیز کی محبت میں امیرانِ فرنگ کو جھیلنے پڑے۔ اگر جیل سے باہر پولیس نے ان پر لاٹھی بربستی تو جیل کے اندر حکام جیل منبر دار اور وارڈروں کی جمعیت لے کر ان پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اور اس قدر پیٹا جاتا کہ آج سال ہا سال گزر جانے پر بھی اکثر لوگوں کے جسم میری بات کی شہادت دیں گے۔

۱۹۴۳ء میں ملتان اولڈ سنٹرل جیل میں محض ایک نعرہ کی بنا پر سیاسی قیدیوں کو اس بے دردی کے ساتھ پیٹا گیا کہ ان کے زخم بستے بستے ناسور بن گئے تھے سردی کا موسم تھا اور راتے والوں نے بغیر طبی امداد کے تمام زخموں کو بارکوں میں بند کر دیا اور دو ماہ تک کوئی طبی امداد نہ دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی درد بھی بڑھنے پڑھنے زندگی بھر کا رنگ بن گیا نا دھوپ تاپنے کی اجازت تھی نہ باہر نکل کر کھانے کی کپڑوں میں جوئیں چلنی لگی جسم کی میل نے زخموں پر تیزاب کا کام کیا۔ رات رات بھر درد کی شدت سے کرتے گذر جاتی تھی یہ سزا صرف انقلاب زندہ باد کہنے کی تھی۔ یوں رہے یہ زمانہ سرسکندہ حیات کی دزارت کا زمانہ تھا۔

اولڈ سنٹرل جیل کے حکام شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ انقلاب زندہ باد ہو کر رہے گا اور ظلم کی یہ ساری داستان آئینہ کی طرح وہ اپنے روبرو پائینگے۔ وقت گزرے



گیانم اچھے ہو گئے مگر نہ وزارت ہی رہی نہ وہلستان اولڈ سنٹرل (۱) جیل

(۱) یہ جیل اب ایک کارخانے میں تبدیل ہو چکی ہے۔

نہ زید کا وہ تم رہا نہ زیاد کی وہ جفا نہ ہی

جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی کر بلا

آج کل جیل خانہ کے نقشہ میں جو تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں یہ انہیں قریباً انہوں کا اثر

ہے حال کا جیل خانہ ماضی کے مقابل ایک آرام دہ سرٹے سے زیادہ دکھائی دیتا ہے

۱۹۲۶ء کے اوائل خضر وزارت کے خلاف جن لوگوں کو جیل جانا پڑا۔ ان کی

معیاد اسیری جمعہ آٹھ دن ہے۔ اس عرصہ میں انیس جیل خانوں میں جو سہولتیں میسر

آئیں شاید ان میں سے اکثر کو اپنے گھروں میں بھی میسر نہ ہوں لیکن آج جب وہ اپنی

تاریخ بیان کرتے ہیں تو میں ہنس دیتا ہوں۔

کے آمدی اور کے پیر شدی

جن لوگوں کے خونِ ناحق سے اس تصویر میں جان پڑی ہے وہ کسی کو یاد بھی نہیں

لیکن یہ بنے بنائے گھر میں آرام کرنے والے ساری تحریک کے نو مالک بن بیٹھے ہیں۔

۱۹۲۶ء کے آخر میں جب وہ سی جنگِ عظیم کا اعلان ہوا۔ تو تمام سیاسی کارکنوں

کو تیلوں میں ڈس دیا گیا۔ ان دنوں سرمنوہر لال وزیر جیل خانہ تھے۔ انہوں نے سیاسی

قیدیوں کی خوراک میں نئے سرے سے تبدیلی کی۔ سب کو بستر کلاس میں رکھنے کا حکم

دیا۔ مہنگائی کا زمانہ تھا ان دنوں اس خوراک کی قیمت ایک روپیہ چار آنے تھی۔



۱۔ گھی ڈیڑھ چھٹانک

۲۔ چینی ایک چھٹانک

۳۔ دودھ پاؤ بھر

۴۔ گوشت پاؤ بھر

لکڑی۔ سبزی۔ آٹا۔ مرچ۔ نمک وغیرہ۔ اس خوراک سے پونے تین آنے پختے تھے۔ ہفتہ بھر کی اس جمع شدہ رقم سے باوام گھی اور کبھی کبھار پھل منگوانے کی اجازت تھی۔ جو لوگ گوشت کے عادی نہیں تھے وہ دودھ زیادہ لیتے تھے۔

اپنے خرچ پر باہر سے ہر چیز منگوانے کی عام اجازت تھی۔ اس کے لئے کوئی رقم متین نہیں تھی۔ اس سے پیشتر سیاسی نظر بندوں کے لئے دیوی کمیپ بنایا گیا تھا۔ جہاں ملک بھر کے سیاسی ورکر رکھے گئے تھے۔ انہیں ۱۹ روزانہ کی خوراک اور بیس روپیہ ماہوار ذاتی خرچ کے لئے ملتے تھے۔ جس سے نظر بند اپنی ضروریات زندگی فرید سکتے تھے۔

دیوی کمیپ اجمیر سے ۵۵ میل دور اور سی۔ پی لائن کے اسٹیشن کوٹہ گوندی سے ۵۵ میل دور ایک قصبہ کا نام تھا جہاں بارہ بارہ کوس تک کتابھونکنے کی آواز سنائی نہیں پڑتی تھی۔ یہ جگہ پہلے فوجی کمیپ تھا بعد میں اسے سیاسی نظر بندوں کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔ کمی سوئیل کے ارد گرد خاردار تاروں کا حلقہ سا بنا کر اس کے مختلف کونوں میں مچان بنا کر فوجی متعین کر دیئے گئے تھے جن کی نوکری ہر تین گھنٹے کے بعد



تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ یہاں ہر ہفتہ ٹھیکیدار دوکانیں لے کر آجاتے اور نظر بند حسب ضرورت پرچی دے کر چیزیں خریدتے بعد میں یہ رقم ٹھیکیدار گورنمنٹ سے وصول کرتا پھر نظر بند اپنے اپنے صوبوں کی جیلوں میں منتقل کر دیئے گئے چھ سال کے بعد جب لڑائی ختم ہوئی تو یہ لوگ رہا ہوئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۶ء کے وسط کا ذکر ہے۔

جب سرخضریات ٹوانہ نے اپنی وزارت ترتیب دی تو لالہ بھیم سین سچندر جیل خانہ بنائے گئے انہوں نے ایک طرف سیاسی قیدیوں کی سلسلہ ۱۹۳۹ء والی پوزیشن کو برقرار رکھا دوسری طرف جیل خانوں سے کوہلو۔ خراس۔ چکی۔ سرخی جیسی انسائیت سوز مشقتوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔

تقسیم ملک کے بعد حالات نے نئی کرٹ ملی اور اس کے ساتھ ہی جیل خانوں کے قوانین میں چند اہم تبدیلیاں ہوئیں جن کا ذکر زیر کتاب کے گزشتہ صفحات پر آچکا ہے۔ لیکن سیاسی قیدیوں کے مقصد جوں کے توں رہے۔ ۱۹۵۳ء کے آخر میں جب پاکستان کی جیلوں میں جانے کا موقع ملا۔ تو حالات پہلے سے بھی بدتر پائے گئے باوجود صیاد پرانا اور تجربہ کار تھا۔ مگر نئے آئین کے آتے ہی ان میں ایسی اتبری پھیلی کے کیاب شیشے میں ڈال شراب سیخ پر۔

سینٹی ایکٹ کی دفعہ تھوڑے کا تحت جن لوگوں کو گرفتار کیا جاتا ان کیساتھ جیل خانہ میں بی ٹاس کے قیدیوں کا سلوک ہوتا یہ پاکستان گورنمنٹ کا آئین تھا۔ تاریخ تحفظ ختم موت کے سلسلے میں جو لوگ جیلوں میں گئے ان کی دو قسمیں تھیں۔



اول وہ جو قانون کی خلاف ورزی میں پکڑے گئے اور سزا پایا ہوئے دوسرے  
 نظر بند جنہیں پولیس گھروں سے اسلٹی ایکٹ دفعہ ۳ کے تحت پکڑ لائی تھی۔ اول الذکر  
 میں اکثر وہ لوگ تھے جنہیں انگریزی عہد میں ہمیشہ بی کلاس ملتی رہی۔ لیکن جب یہی  
 لوگ ختم نبوت کے نام پر اسلامی ریاست کے جیل خانوں میں آئے تو ان سے تیسری  
 کلاس کے قیدیوں کا سا سلوک کیا گیا اور نظر بندوں کو بی کلاس دی گئی۔  
 سی کلاس کے سیاسی قیدیوں کو عام قیدیوں کی خوراک دی گئی لیکن اب  
 کی بار بی کلاس کے قیدی کا معیار پہلے سے مختلف تھا۔ ایک روپیہ ۱۰ ار کی خوراک  
 دی جاتی تھی۔ جسے اس طرح تقسیم کیا گیا تھا۔

- |         |            |
|---------|------------|
| ۱۔ گوشت | ۳ چھٹانک   |
| ۲۔ گھی  | ایک چھٹانک |
| ۳۔ چینی | ایک چھٹانک |
| ۴۔ دودھ | آدھ پاؤ    |
| ۵۔ لکڑی | دوسیر      |
| ۶۔ آٹا  | آدھ سیر    |

۷۔ چائے۔ نمک۔ سبزی۔ سرچ وغیرہ

یہ خوراک قریباً ڈیڑھ ماہ تک ملتی رہی مگر یکا یکی ایک دن حکام جیل نے  
 حکام بالا کے حکم پر بی کلاس کے قیدیوں کو ہفتہ میں پانچ دن گوشت اور دو دن



تین پاؤدودھ دینے کا فیصلہ کیا۔ تھوڑے دنوں بعد ایک اور پیغام آیا کہ اب بی کلاس کے قیدیوں کو دو آنہ روزانہ کا پھل بھی ملیگا۔ پھر ایک اور حکم ہوا کہ روزانہ ڈیڑھ پاؤدودھ ملے گا اور گوشت ہفتہ بھر اس اثنا میں یاد رہے کہ پھل صرف دو دن ہی ملا۔ اچانک آئی۔ جی۔ جیل خانہ جات کی تشریف آوری کی اطلاع ملی۔ قیدیوں کو اس آفیسر کے آنے کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یہ آفیسر قیدیوں کو کٹوتی کے کچھ نہ کچھ دن دے جاتا ہے۔ لیکن اب کے جو تشریف لائے۔ تو بجائے قیدیوں پر نظر کرم کرنے کے سیاسی نظربندوں سے چار پائٹوں کے چھینے کا آرڈر دے گئے۔

جیل خانہ کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ بی کلاس کے قیدیوں سے چار پائٹوں کی مراعات چھپی لی گئی ہیں۔ انگریزی عہد اقتدار میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ خیر..... تھوڑے ہی عہد میں دو عہد فی کس ملتے تھے۔ اور ملاقاتیں بھی اسی حساب سے یہ لائل پور جیل کی بات ہے۔

راولپنڈی جیل میں آئے تو اس سے مختلف نظام پایا۔ خوراک:

گوشت	۳ چھٹانک روزانہ (ہفتہ میں ۵ دن)
گھی	۱ چھٹانک
چینی	۱/۲ چھٹانک
گڑ	۱/۲ چھٹانک
دودھ	ادھ پاؤ براٹے چائے



۱/۸ چھٹانک

چائے کی پتی

دوسیر

لکڑی

نصف سیر روزانہ

آٹا

تین پاؤ (ہفتہ میں ۲۲ دن)

دودھ

خطوط ہفتہ میں اعداد فی کس۔ تھوڑے دنوں میں ہفتہ میں دو عدد فی کس

کا حکم ہوا۔ چارپائیوں کی مراعات یہاں بھی چھین لی گئیں مگر اسی جیل میں بی کلاس کے اخلاقی قیدی کے پاس چارپائی بدستور موجود رہی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بی کلاس کے سیاسی نظر بندوں سے چارپائیاں چھین لینا پنجاب گورنمنٹ کا حکم تھا یا جناب آئی۔ جی جیل خانہ جات کا اگر یہ حکومت پنجاب کا حکم تھا تو راولپنڈی جیل میں بی کلاس کے اخلاقی قیدی کے پاس چارپائی کیوں رہی۔

اگر یہ حکم خود آئی۔ جی جیل خانہ جات کا ہے کہ صرف سیاسی نظر بندوں سے چارپائیاں چھین لی جائیں۔ تو کیا ان کا یہ حکم تحریک تحفظ ختم نبوت کے نظر بندوں سے مذہبی انتظام تو نہیں تھا۔ جیسا کہ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ قادیانی ہیں۔ راولپنڈی پہنچ کر معلوم ہوا کہ گجرات جیل کے سیاسی نظر بندوں کو حسب ذیل خوراک ملتی تھی۔

۳ چھٹانک یا اس کی بجائے اندھے

گوشت



۱/۴ چھٹانک یا مکھن	گھی
۱ چھٹانک	چینی
۶ چھٹانک یا سوچی کی ڈبل روٹی	آٹا
۳ چھٹانک	چاول
۲ چھٹانک	دودھ برائے چائے
۱ پاؤ بھر روزانہ	دودھ
دوسیر	لکڑی
پاؤ بھر	سبزی
۶ آنے ہفتہ بھر میں	پھل

یہ تو تھی پنجاب کی مختلف جیلوں میں خوراک کی متضاد روئداد اب اس سلسلے میں سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ کے ایک خط کی نقل ملاحظہ فرمادیں۔

سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ (محکمہ مالیات)

مراسلہ ۷۲۷۲/۵۲/۳۳ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۲ء

راشن سکیل برائے اعلیٰ کلاس نظر بندان

آٹا  
۳ چھٹانک



۳ چھٹانک یا ۴ چھٹانک تک ڈبل روٹی	چاول
یا ۱۰ چھٹانک تک دودھ	گوشت
$\frac{1}{2}$ چھٹانک	گھی یا مکھن
۱ چھٹانک	چینی
$\frac{1}{8}$ چھٹانک	چائے پتی
چھ چھٹانک	دودھ
۴ چھٹانک	سبزی تازہ
۲ چھٹانک	آلو
$\frac{1}{4}$ چھٹانک	مصالحہ
$\frac{1}{4}$ چھٹانک	نمک
$\frac{1}{4}$ چھٹانک	لائم جوس
۶ آنے ہفتہ بھر	پھل تازہ

اس خوراک کی کل قیمت ایک روپیہ چودہ آنے پانچ پائی بنتی تھی اور جو خوراک راولپنڈی جیل میں دی جا رہی تھی۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ۱۱ آنے بنتی تھی گویا ۴ آنے ۵ پائی کی روزانہ خوراک فی نظر بند کم ملتی رہی۔ یہ حساب صرف راولپنڈی جیل کا تھا۔

باقی ع قیاس کن زر گلستان من بہار مرا  
اس سے آپ اندازہ کریں کہ جب اوپر کی کلاس کے قیدیوں کے ساتھ یہ کچھ  
ہو رہا ہے تو عام سی کلاس کے قیدیوں سے کیا کچھ ہوتا ہوگا۔



# کالاپانی

ہندو پاکستان کے درمیان لکیر کھینچنے سے پیشتر انگریزی حکومت اپنے مجرموں کو جن کے لئے عدالت جیس دوام کی سزا تجویز کرتی تھی کچھ عرصہ مقامی جلیوں میں رکھنے کے بعد کالاپانی (انڈیمان) بھیج دیا کرتی تھی۔

سکھوں کے عہدِ اقتدار میں ایسے مجرموں کو کالاباغ بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ جگہ گئے جبکات سے ڈھکی ہوئی بندر بالا پہاڑوں کے دامن میں باڑہ گلی سے ایک میل آگے اور نیچا گلی سے تین میل ادھر واقع ہے شاید اسی نسبت سے آج بھی اسے کالاباغ کے نام سے پکارتے ہیں۔ **اس میں فوجی چھاؤنی ہے۔**

۱۷۹۶ء میں جزیرہ انڈیمان کو ایک انگریز لیفٹیننٹ بلیر نے دریافت کیا تھا اس تعلق کی بنا پر اس جزیرے کا نام پورٹ بلیر تجویز ہوا اور جس دوام کے



قیدی یہاں رکھے جاتے تھے ان کی پیشانی کھدوا کر قیدی کا نام برہم اور لفظ دوام  
الجس لکھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہاں کے ناموافق ہونے کے باعث یہ جگہ آباد ہو کر پھر  
ویران ہو گئی۔

اٹھارہ سو ستاون ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے باعث انگریز حکمرانوں نے مارچ  
۱۸۵۷ء میں پھر سے ضرورت محسوس کی کہ اس اجڑی ہوئی لستی کو از سر نو آباد کیا جائے  
چنانچہ سب سے پہلے ان مقدس قیدیوں کو یہاں لایا گیا جنہیں انگریزوں کے خلاف آزادی  
وطن کے لئے لڑائی لڑنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا ان قیدیوں میں مولانا فضل حق  
خیر آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۱۸۶۱ء میں انکی موت یہیں واقع ہوئی اور آج  
بھی ان کا مزار اسی سنگلاخ وادی میں درسِ حیات دے رہا ہے۔

جزیرہ انڈیمان مدارس سے آٹھ سو میل کلکتہ سے چھ سو میل سنگاپور سے  
چار سو میل اور پاننگ سے تین سو چاس میل دور واقع ہے کالے پہاڑوں کا ٹیلا  
دو سے دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے بھینسوں کے جھنڈ کے جھنڈ پانی میں  
تیر رہے ہیں۔ مونٹ ہریٹ جو سطح زمین سے گیارہ سو سولہ فٹ کی بلندی پر ہے  
اس کے دامن میں یہ آباد جزیرہ جہاں مٹی سے لومبر تک بارش ایک ساتھ ہوتی  
رہتی ہے لیکن اولے نہیں پڑتے اس کے باوجود موسموں میں کبھی تصادم نہیں ہوا  
اور یہاں کے باشندے لحاف اور چادر سے ہمیشہ بے نیاز رہتے ہیں۔

اس جزیرے میں قدیم سے ایک وحشی قوم آباد ہے جن کے مرد عورتیں



ہمیشہ مادرزاد ننگے رہتے ہیں کپڑا نہیں میسر ہی نہیں آتا نہ معلوم یہ لوگ کس سے  
یہاں آباد ہیں۔ تاہم ان کا بیان ہے کہ

دنیا پر ایک بہت بڑا طوفان آیا تھا اور ساری دنیا ڈوب  
گئی تھی اور ان جنگلوں کے بزرگ ایک کشتی بنا کر اس پر سوار  
ہو گئے تھے اور جب یہ طوفان رفع ہوا تو وہ کشتی کسی پہاڑ منجملہ  
کوہ ہائے انڈیمان میں پڑی تھی۔

قیدیوں کا جہاز انڈیمان پہنچ کر کنارے سے دور لنگر انداز ہوتا تھا بوٹ اور  
کشتیاں وہاں سے قیدیوں کو روس نام کے ٹاپو پر جو صدر مقام ہے انڈیمان کا  
لے آتی تھیں ابتدائی کاروائی کے بعد نئے قیدیوں کو مختلف برکوں میں بھجوا جاتا تھا۔  
یہ برکیں کسی چار دیواری میں نہیں بلکہ کھلی فضا میں تعمیر کی گئی تھیں ایک مہینہ کے  
بعد نئے قیدیوں کی مٹھکڑیاں کاٹ دی جاتی تھیں لیکن مشقت اسی طرح لی جاتی تھی  
جس طرح پاک و ہند کی جلیوں میں اور انہیں تین ماہ بعد گھر خط لکھنے کی اور اسی  
ترتیب سے خط منگوانے کی اجازت تھی البتہ ان کے نگران نہ تو فوجی آفیسر ہوتے  
اور نہ پولیس بلکہ پرانے قیدی ان پر بندہ اور تھے جن کے سروں پر لال دوپٹہ  
اور گلے میں چڑیا سی ہوتی تھی۔

چار پانچ برس کے بعد ہر قیدی کو اس کی نیک چلنی کے باعث تنخواہ ملنے لگتی

تھی اور خط ایک ماہ بعد۔



دس برس قید گزرنے پر ہر مرد قیدی ٹکٹ پانے کا مستحق ہوتا تھا یہ ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد قیدی آزاد ہو کر یارک سے نکل جاتا تھا پھر یہ شہر اور بستیوں میں رہ کر اپنا کوئی پیشہ کر سکتا تھا اس قسم کے قیدیوں کی پچاس ساٹھ بستیاں ہارڈن کے دامن میں آباد تھیں جن کا سارا نظام قیدیوں کے سپرد تھا پٹواری منبر وار چوکیدار سب کے سب قیدی تھے جو لوگ کھیتی باڑی کرنے کا ٹکٹ لیتے تھے انہیں پندرہ بیگہ زمین مفت دی جاتی تھی پھر وہ چاہے ہزاروں روپے پیدا کرے۔ کوئی حساب لینے والا نہیں تھا مگر ٹکٹ حاصل کرنے سے پہلے کوئی قیدی اپنے پاس ایک پیسہ نہیں رکھ سکتا۔ بیس برس گزرنے کے بعد قیدی رہا ہو کر چاہے اپنے وطن واپس چلا جائے یا وہ بیوی بچے منگوا کر کاروبار کرے۔

عورتیں اسی جگہ الگ جزیرے میں قید ہوتی تھیں انہیں بھی اپنی سیرک میں پائی اور سلائی کا کام دیا جاتا تھا انہیں پانچ برس کے بعد ٹکٹ مل جاتا تھا مگر جو ان عورتیں ٹکٹ پانے تک سیرک سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد ہر عورت اور مرد کو انادی حاصل تھی کہ وہ جس سے چاہیں شادی کر لیں یہاں کے قانون اور رسم کے مطابق ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد قیدی مرد کو اجازت تھی کہ وہ عورتوں کے ٹالوں میں چلا جاتا اور جس عورت سے وہ شادی کرنا چاہے کچھ نقد دے دلا کر اسے راضی کر لیں پھر انہیں جزیرے کے کمشنر کے روبرو پیش ہو کر اقرار نامہ تحریر کرنا پڑتا تھا جس میں باہم مل کر رہنے اور آپس کی



محبت کا قرار ہوتا تھا۔ پھر شادی کے بعد میاں بیوی جیسے چاہیں رہیں قانون کی کوئی دیوار ان کے راستے میں حائل نہیں تھی۔

دوسری بڑی لڑائی میں یہ جزیرہ جاپان کے قبضہ میں چلا گیا تھا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جاپانیوں کی بمباری سے قیدیوں پر کیا گزری اور اب یہ جزیرہ بھارت کے نقشہ میں ہے مگر کوئی قیدی وہاں نہیں بھیجا جاتا۔

پاکستان میں عبور دریائے شور کے مجرموں کو پنجاب کی مختلف جلیوں میں رکھا جاتا ہے اور خاص کر نیوسنٹرل جیل ملتان ایسے قیدیوں کے لئے مخصوص ہے۔



# قتل

آدمی اور آدمی کے درمیان دشمنی کی عمر تاریخ کی عمر سے بہت زیادہ ہے  
پھاڑوں کے غار سمندر کے کنارے تو اس کے گواہ ہو سکتے ہیں۔ مگر کاغذ اور  
روشنائی کی مرکب تاریخ اس سے تہی ہے۔

آدمی کے لہو سے زمین کا دامن کہاں کہاں سے داغدار ہے۔ اس کیلئے  
کوہ سینا کے میدان بابل اور نینوا کے ایوان سلطنت بمصر کے اہرام عراق  
کے صحرا اور کربلا کی پکتی ہوئی ریت ہی چشم دید گواہ ہو سکتے ہیں۔ ان کی گرہ  
میں ہزاروں برس پیشتر کے نقشے بندھے ہوئے ہیں جو انسانی خون کے چھٹیوں  
سے داغدار ہو رہے ہیں طوفانِ لوح کے بعد دریائے نیل، دجلہ اور فرات  
کے پانی بھی زمین کی چھاتی سے انسانی خون کے دھبے دھونے میں ناکام



رہے ہیں۔ لہذا یہ سوال تاریخ سے نہیں زمین سے پوچھنے کا ہے کہ آدمی اور  
آدمی کے درمیان دشمنی کی آگ کب سے شعلہ فشاں ہے۔

دنیا کا سب سے پہلا قاتل قابل ہے جس نے اپنے بھائی ہابیل کو عورت  
کے انتقام میں قتل کیا۔ ابن آدم کا یہ خون جو زمین کے دامن پر گرے۔ اس کے  
بعد کا ہر خون اسی خون کی صدائے بازگشت ہے۔

ڈرائی مہذب سلطنتیں لڑیں یا گاؤں کا جھاٹ دونوں کے موضوع  
میں بلل یہاں فرق نہیں البتہ طریق کار میں اختلاف تھا۔ اور ہے لیکن خون  
انسانی کی اذاتی میں کسی نے دریغ نہیں کیا۔

مہابھارت کی ڈرائی میں ہزاروں انسانوں کا خون کسی اصول کیلئے  
نہیں۔ بلکہ عورت کیلئے بہا یا گید راون اور راجہ رام چندر کے درمیان بھی عورت  
کے حصول کیلئے ڈرائی تھی۔ دروہتی۔ سیتا اور کلوتیہ ایسی ان گنت عورتیں پونے  
اور ایشیا کی تاریخ پر قابض ہیں کہ انسانی کھوپڑیوں پر ان کے لئے محل تعمیر  
کئے گئے۔ آدمی کا خون ان کے عارض پر غلظہ بن کر چمکا۔ جس کی روشنی میں  
میلوں تک جوانیاں ٹھوکریں کھاتی نظر آئیں۔

ہوس ملک گیر، کے لئے جنوں نے انسان کو وہ مقام عطا  
کیا کہ اسے اپنے اندر کے لئے انسانوں کو تھپوں کے پاؤں سے کچلنا پڑا۔  
گھوڑوں کے سموں تلے اور شیروں کے پنجروں میں ڈالنا پڑا۔ سانپوں کے



نہر کی آزمائش کی گئی آگ کے الاؤ میں انسانی چربی نے آگ کے حسن کو جلا بخشتی  
بتوں کو آدمی کے لہو سے خدا بنایا گیا انسانی شرم گاہوں کی پرستش کیلئے آدمی  
بھینٹ چڑھایا گئے۔

یہ سب کچھ قانون کے سائے میں ہوا۔ قانون کے لئے ہوا۔ قانون کے  
نگاہداروں نے کہا دنیا میں ہر چیز کی قیمت ہے۔ لیکن انسانی لہو کی کوئی قیمت  
نہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو قانون شخصی خون کا محاسبہ کرنے کی بجائے اجتماعی خون کی  
پشت پناہی کبھی نہ کرتا۔

کوئی ہے؟ جو امریکہ سے سوال کرے کہ ہیروشیما کے پانچ لاکھ انسانوں کا  
خون کس کی گردن پر ہے۔

اٹلی کے یوانوں میں آواز دے۔ کہ جہتہ کی مظلوم آبادی کے خون کا حساب  
کب اور کہاں دو گئے۔

لندن کے سیاست دانوں کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پوچھے کہ اے نوع  
انسان کے خون کے ذمہ دارو تمہارے بچتے ہوئے چراغ کی عمر میں اور کتنی ساعتیں  
باقی ہیں مگر کوئی نہیں پوچھے گا۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ قانون کے سائے میں ہوا۔  
قانون کے لئے ہوا۔ اور قانون کے نگاہ داروں نے کیا۔

آج تاریخ کی پیدائش کو برسوں گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں زمانہ اپنی رفتار  
کے ساتھ سنکھ پامیل کا سفر طے کر کے اس پنج پر جا رہا ہے۔ جہاں فکر انسانی مریخ



سے بھی پرے کے لئے پرتول رہی ہے۔ سمندر کے پانی کو مارت ہوئی۔ کہ وہ کھنگال چکی ہے۔ پہاڑوں کی چھاتیاں انسانی بوجھ سے چنچ اٹھی ہیں انسانی اقتدار۔  
اقتدار نیرواں کے قریب پہنچ چکا ہے۔

اس مہذب دنیا میں اس تاریخ کی دنیا میں۔ اس علم و سائنس کی دنیا میں  
 انسان کا لہو اسی طرح اڑاں ہے جس طرح تاریخ کی پیدائش سے پہلے تھا انسان  
 کا لہو آج بھی نالیوں میں حیرانوں کے لہو کے ساتھ بہتا ہے۔ انسان کا لہو کل بھی  
 بے قیمت تھا اور آج بھی بے قیمت ہے۔

ماضی میں زن اور زمین بتائے فساد تھے اور آج بھی لاکھوں انسانوں کے  
 خون کی ذمہ داری سے یہ دونوں مشتینا نہیں کئے جاسکتے۔

آج بھی انسانی لہو کی سرخیوں سے شہنشاہوں کی عیاشیاں پاک نہیں سلطنتوں  
 کے یوان آج بھی انسانی لہو کے دھبوں سے تراب ہو رہے ہیں۔ عدالتوں کے  
 کہڑوں سے آج بھی انصاف کے خون کی پو آ رہی ہے

میدان جنگ سے لیکر عشرت کدوں تک انسانی لہو کی نہریں نہ نکلیں ہیں  
 جن کے کنارے کھڑے ہو کر فرانس، کامشہور افسانہ نگار مسوس پال (MOS PAL)  
 کہتا ہے

وہ اپنی موت کے وقت عدالت عالیہ کی صدارت کر رہا تھا وہ ایک  
 جج تھا جس کی دیانتداری مسلمہ تھی اور جس کی بے عیب زندگی.....



فرانس کی سب عدالتوں میں مثالی حیثیت رکھتی تھی جب ایڈوکیٹ بار کے جوئیئر نمبر اور دو سکریج اس کا لمبا زرد اور سنجیدہ پہرہ چمک دار آنکھیں دیکھتے تو اظہارِ تعظیم کے لئے جھک جاتے۔ اس نے اپنی زندگی جرم کی بے کہنی اور نالواؤں کی حفاظت کیلئے وقف کر رکھی تھی بد معاشوں اور قاتلوں کا اس سے زیادہ خوفناک دشمن کوئی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کی روح کی گہرائیوں میں مقفی راز پڑھ لیتا ہے۔

جب بیاسی سال کی عمر میں اس کی موت واقع ہوئی تو ہر مشہور آدمی نے اظہارِ عقیدت کیا اور عدالت سے متعلق لوگ اس کی قبر تک ساتھ گئے۔ سرخ پتلونیں پہنے سپاہی اس کی آخری آرام گاہ تک ہمراہ تھے سفید ٹائیوں والے اشخاص نے غم سے محمور الفاظ ادا کئے اور اسکے تابوت پر آنسو بہائے۔

اس کے ورثہ میں جہاں وہ بدترین مجرموں کی فائلیں رکھا کرتا تھا اس کے غم گزیدہ پیش کار کو مندرجہ ذیل دستاویزیلی اس کا عنوان تھا

## کیوں

۲۵ جون ۱۸۵۷ء میں ابھی ابھی عدالت سے آیا ہوں بلوناٹل کیلئے میں نے جو سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا وہ اُسے سنا دی گئی ہے۔ میں حیران ہوں کہ اُس شخص نے اپنے پانچ بچوں کو کیوں قتل کیا۔



زندگی میں کئی بار ہمیں ایسے آدمی ملتے ہیں جن کے لئے زندگی کی تباہی ایک آسمانی مسرت ہوتی ہے یہ درست ہے اور اسے سمجھا بھی جاسکتا ہے یقیناً قتل کا فعل تخلیق کا دوسرا پہلو ہے تخلیق اور تباہی۔ یہ الفاظ موجودہ دور میں ہر چیز کا خلاصہ ہیں قتل ہمارے گریہ کیوں ہے؟ ۲۵ جون۔ یہ سوچتا کہ اس زمین پر ایک ایسی مخلوق ہے جو جلتی رہتی ہے اور دڑتی ہے ایک مخلوق؛ یہ مخلوق کیا ہے؟ یہ جلتی جاگتی اور سانس لیتی چیز کیا ہے جو حصول تحرک کو مادی شکل میں ظاہر کرتی ہے اور قوتِ ارادی کی مالک ہے جو سب حرکات کو قابو میں رکھتی ہے اس چیز کی کوئی جڑیں نہیں اس کے پاؤں زمین میں پیوست نہیں یہ زندگی کا بیج ہے جو زمین پر بکھیر دیا گیا ہے اور یہ زندگی کا بیج؛ میں یہ تو نہیں جانتا کہ کب آیا لیکن اسے تباہ کیا جاسکتا ہے اور یہ اس کا خاتمہ ہے یہ گل سڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔

۲۶ جون۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ پھر قتل کرنا جرم کیوں ہے؟ واقعی جب قدرت کا قانون ہے زندگی ختم کرنا ہر مخلوق پر لازم ہے۔ یہ کہہ رہے ہیں لیکن یہ بھی محض قتل کرنے کے لئے..... قتل کرتا ہے قتل کی جبلت ہمارے خون میں ہے۔ ہم خود کو اس سے بچا نہیں سکتے ایک حیوان ہمیشہ قتل کرتا رہتا ہے یہ دن



بھرا اور اپنی زندگی کے ہر منٹ میں قتل کرتا ہے آدمی بھی ہمیشہ قتل کرتا رہتا ہے صرف خوراک حاصل کرنے کیلئے نہیں کیونکہ اسے تو قتل کا محض لطف لینے کے لئے کیا جاتا ہے اس نے شکار یا بھاد کیا ہے پھر ہر اس کیڑے کوڑے کو جو اسے ملے مار دیتا ہے اور ان سب چھوٹے موٹے پرندوں اور حیوانوں کو بھی جو اس کے ہاتھ لگ جائیں مار دیتا ہے لیکن اس سے بھی ہماری ناقابل مداخلت ہوس کی تسکین نہیں دیتا جو ہم میں نختہ ہو چکی ہے۔

حیوانوں کا قتل کافی نہیں ہمیں اپنے ہم اثر انسانوں کو بھی قتل کرنا چاہئے پہلے پہل اس جہالت کی تسکین انسانی قربانیوں سے کی جاتی تھی۔ آج سماج میں مل کر اپنے کی ضرورت نے قتل حرم بنا دیا ہے۔ قاتل پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ اور اُسے سزا دی جاتی ہے لیکن جیسے کہ ہم بعض اوقات اس فطرتی اور رنجور کرنے والے جذبہ کو بالکل ختم نہیں کر سکتے تو ہم وقتاً فوقتاً جنگوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں جن میں ایک پوری قوم دوسری قوم کو قتل کر دیتی ہے یہ خون کی رنگ ریلوں پر منتج ہوتی ہے افواج پاکل پن میں دھکیل دی جاتی ہیں یہ لگاڑ پوری شہری آبادی کے سروں میں سما جاتا ہے اس میں بھڑکیں اور بچے بھی شامل ہیں جو شام کو جب پتیلیاں جلتی ہیں تو ان خون ریزیوں







بھی نہیں اپنے دماغ کی بدولت یہ کائنات کا عکس ہے یا داشت  
 اور علم کی بدولت یہ دنیا کا پتھر ہے اس سب کا عکس یہ ہے اور رہا  
 ہے کہ ہر آدمی کی ذات میں ایک چھوٹی سی دنیا ہے جو بڑی دنیا میں  
 رکھ دی گئی ہے لیکن ایک فرد کے حقیر اور بے معنی ہونے کا اتصال  
 کرنے کے لئے آپ کو سفر کرنا ہوگا کسی جہاز میں سوار ہو کر جائے  
 اور سمندر میں چل دیجئے۔ ساحل لوگوں سے بھرا ہوا ہے لیکن تھوڑی  
 دیر میں آپ ساحل کی لکیر کے سوا کچھ نہیں دیکھیں گے چھوٹی چھوٹی  
 انسانی مخلوق غائب ہو چکی ہے یہ اتنی چھوٹی اور حقیر ہے یورپ کو  
 ایکس پریس ٹرین میں عبور کیجئے اور کھڑکی میں سے باہر دیکھئے  
 آدمی۔ آدمی اور بھی زیادہ آدمی ان جانے ان گنت آدمی کلبوں  
 میں ہجوم درہجوم کھیتوں میں گروہ درگروہ احمق و ہنقان جو صرف  
 زمین کاشت کرنے کی ہی عقل رکھتے ہیں۔

بد صورت عورتیں جن کی زندگی میں صرف یہی مقصد ہے کہ اپنے  
 شوہروں کے لئے کھانے تیار کریں اور بچے جنمیں۔

ہندوستان میں جاییں چلیں میں جاییں وہاں بھی آپ لاکھوں انسان  
 پیدا ہوتے اور مرتے دیکھیں گے جو اپنے پیچھے اتنا ہی نشان چھوڑتے  
 ہیں جتنا کہ رطک میں گہلی ہوئی چینی چھوڑ جاتی ہے۔



جستی ممالک میں بجائے جہاں آدمی مٹی کے گھروندوں میں مل کر رہتے ہیں۔

صاف چمڑی والے عربوں کے ممالک میں بجائے جو ہوا میں پھڑپھڑاتے ہوئے خالی خمیوں میں رہتے ہیں آپ کو احساس ہوگا کہ فرد کوئی حیثیت نہیں رکھتا صرف نسل اہمیت رکھتی ہے ایک صحرا نورد قبیلہ اپنے افراد کا خیال رکھتا تو ہے لیکن بہت کم اور یہ آدمی جو عقل مند ہیں موت سے نہیں ڈرتے اور نہ یہ افراد کی کچھ فکر کرتے ہیں ایک آدمی اپنے دشمن کو قتل کرتا ہے، یہ جنگ سے ہے اور اسی طرح پرانے زمانے میں بھی تھا۔ ایک جاگیر دار دوسرے جاگیر دار سے لڑتا تھا۔

ہاں دنیا بھر کا سفر کیجئے اور ہجوم در ہجوم سالوں کو دیکھئے جو ان گنت اقدان جلنے — ان جانے۔ ان جانے، ہاں اب آپ نے اس امر کا راز پالیا ہے قتل اس لئے جرم بن گیا ہے۔ کیونکہ آج کل ہر فرد کا رجسٹرڈ میں اندراج کیا جاتا ہے جو نہی بچہ پیدا ہوتا ہے اس کا نام رجسٹرڈ میں درج کیا جاتا ہے۔ قانون اسے اپنے پیروں میں لیتا ہے ایک انسان جس کا نام رجسٹرڈ میں درج نہ کیا گیا ہو شمار نہیں ہوتا آپ اسے بجز زمین پر صحرا میں پہاڑ پر میدان میں یا



کہیں بھی قتل کر سکتے ہیں قدرت موت سے پیار کرتی ہے وہ قاتل  
کو کبھی سزا نہیں دیتی۔

پھر جو چیز حقیقتاً قابلِ تعظیم ہے وہ میونسپل رجسٹرڈ ہے یہ ہے  
وہ چیز جو فرد کی حفاظت کرتی ہے ایک آدمی اس لئے قابلِ تعظیم ہے  
کہ اس کا نام حکومت کے ریکارڈ میں درج ہے سب تکریم میونسپل  
رجسٹرڈ کے لئے جو قانونی خدا ہے اس کے سامنے جھکے حکومت قتل  
کر سکتی ہے کیونکہ اسے رجسٹرڈ میں رد و بدل کرنے کا اختیار ہے۔  
جب یہ جنگ میں لاکھوں انسانوں کو قتل کر چکتی ہے تو یہ ان  
کے نام حذف کر دیتی ہے اس کے رجسٹرڈ بیک جنیشن قلم ان کا  
نام اور نشان تک نہیں رہنے دیتے۔ لیکن ہم جو رجسٹرڈ میں رد و  
بدل نہیں کر سکتے زندگی کا احترام کرنے پر پابند ہیں۔

اے رجسٹرڈ — جلیل القدر معبود جو مقدس مقامات  
میں سے مقدس ترین میونسپل کمیٹی کے دفتر پر حکمرانی کرتے ہو سب  
مرحبا کہتے ہیں تم قدرت سے زیادہ طاقتو ہو۔

۳ جولائی - انسان کو قتل کرتا یقیناً ایک انوکھی اور شدید مسرت  
ہوگی اور سامنے اپنی مٹھی میں ایک زندہ اور ذمی جس مخلوق کو  
دیکھنا اور پھر اس میں سوراخ — بالکل چھوٹا سا سوراخ کر کے بہتا



ہوا خون دیکھنا — خون جو زندگی کا رس ہے اور پھر یہ دیکھنا کہ ایک ٹھنڈے بے حرکت اور بے جان گوشت کے لوتھڑے کے سوا کچھ نہیں رہا جو خیالات کا حامل نہیں ہے۔

۵ اگست۔ کون جان سکے گا؟ کون مجھ ایسے شخص پر شبہ کر سکے گا خاص طور پر جب میں اپنے تجربہ کے لئے کوئی ایسا شخص منتخب کروں جس کے قتل میں بظاہر میرا کوئی مفاد نہ ہو۔

۱۵ اگست۔ ترغیب — یہ ترغیب میری روح میں رہینگے ہوئے کیڑے کی طرح گھس گئی ہے یہ میرے وجود میں اپنی بل کھود رہی ہے۔ میرے پورے جسم میں مساویت کر گئی ہے یہ میرے دماغ میں رچ گئی ہے جہاں تک کہ اس میں قتل کے سوا کوئی خیال نہیں میری آنکھیں خون دیکھنے کے لئے ترس رہی ہیں میرے کانوں میں مرتے ہوئے آدمی کی آخری چیخ ایسی دردناک آواز گونج رہی ہے میرے پاؤں مجھے اس جگہ لے جانے کے لئے کپکپا رہے ہیں یہ کتنا عالی شان نادر اور ایک آزاد آدمی کے شانِ شایانِ کام ہو گا جو عام لوگ

انتہائی محسوسات کی تلاش میں ہو۔

۲۲ اگست۔ میں زیادہ دیر تک مدافعت نہیں کر سکتا تجربہ



کے طور پر میں نے ایک چھوٹا سا جانور قتل کر دیا ہے میرے نوکرنے  
 ایک ننھی سی پکڑیا پنجرے میں بند کر کے باورچی خانہ کی کھڑکی میں  
 لٹکار رکھی تھی میں نے اسے کسی کام کے لئے باہر بھیجا۔ اور ننھے  
 پرندے کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں اس کے دل کی دھڑکن محسوس  
 کرتا تھا میں نے اپنے ہاتھ میں اس کے جسم کی حرارت محسوس کی  
 اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ گاہے لگا ہے میں اسے زیادہ زور  
 سے بھینچ لیتا تھا اس کا دل زور زور سے دھڑکتا یہ احساس خوفناک  
 لیکن مزے دار تھا میں خود کو بہت مشکل سے اس کا گلہ گھونٹے سے  
 بعض رکھے ہوئے تھا کیونکہ میں اس صورت میں خون نہیں دیکھ سکتا  
 تھا میں نے قہقی پکڑنی، ناخن کاٹنے کی ننھی سی قہنجی، اور بڑے آرام  
 سے اس کے گلے پر تین زخم لگائے پر تین زخم لگائے اس کی  
 چونچ کھل گئی اور اس نے بچ نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن میں  
 اسے زیادہ مضبوطی سے پکڑے رہا اور بہتا ہوا خون دیکھتا رہا۔

کتنا خوبصورت — اس قدر سرخ — چمکدار اور صاف  
 خون تھا مجھ میں یہ خون پینے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں نے اسے  
 زبان کی نوکھا سے چکھا کتنا اچھا مزہ تھا لیکن یہ تو ذرا سی بوند تھی  
 کسی پیل کا اتنا خون بہتے دیکھتا کہ وہ مر جائے کتنا شاندار ہوگا۔  
 پھر میں نے بھی قاتلوں کی طرح حقیقی قاتلوں کی طرح عمل کیا



اپنی قچی اور ہاتھ دھوئے اور پانی پینک دیا چڑیا کا جسم —  
اس کی لاش باغ میں رس بھری کے درخت تلے دفن کر دی ...

میں نے فیصلہ کیا کہ روز اس درخت سے ایک رس بھری کھایا کرونگا۔  
چین اپنے پرندے کی جدائی میں روتا رہا اس کا خیال تھا کہ وہ  
اڑ گیا ہے اسے مجھ پر شبہ کرنے کا خیال تک نہیں آسکے گا۔  
۲۵۔ اگست۔ مجھے ایک آدمی کو قتل کرنا چاہئے — ضرور  
کرنا چاہئے — ضرور کرنا چاہئے۔

۳۰۔ اگست۔ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں یہ کتنی وحشت ناک بات  
ہے میں جنگل میں سیر کرتے گیا تھا میں قطعاً خالی ذہن تھا پلگنڈی پر  
میں نے ایک لڑکے کو اپنی طرف آتے دیکھا جو روٹی کو مکھی لگا کر  
کھا رہا تھا جب میں اس کے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے مجھے  
ٹھہرا کر کہا

شب بخیر جناب —

اسے قتل کرنے کا خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے اس سے سوال  
کیا کیوں بیٹا! جنگل میں بالکل اکیلے ہو؟  
جی ہاں!



اُسے قتل کرنے کی خواہش نے شراب کی طرح میرے ذہن کو معاؤف کر دیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھاگ جائے گا لیکن وہ کھڑا رہا۔ میں نے اسے گلے سے پکڑ کر اپنی پوری قوت سے اس کا گلہ گھونٹا۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں لرز گیا اس کی آنکھیں گول گہری چمکدار اور دہشت ناک تھیں مجھے آج تک اتنا خوفناک اور وحشیانہ احساس کبھی نہیں ہوا۔ لیکن انسوؤں کہ یہ احساس بہت ہی مختصر تھا۔

اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے میری کلاٹیاں بھینچ لیں اور اس کا جسم اذیت سے اس طرح دہرا ہوا گیا جیسے کسی پرندے کا جسم آگ کے شعلوں میں چڑھتا ہوا جاتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے کش مکش چھوڑ دی میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا بالکل اس پرندے کی طرح — میں نے اس کا جسم ایک گڑے میں پھینک دیا اور لاش پر گھاس بکھیر دی۔

میں نے گھر جا کر کھانا کھایا یا قتل کتنی معمولی شے ہے میں نے شام بڑے سکون سے گزاری میں بالکل ٹھیک تھا اور خود کو از سر نووع جوان محسوس کرتا تھا میں اپنی عقل کا شکر گزار ہوں۔  
میں خون نہیں دیکھ سکا تھا۔ تاہم پر سکون تھا۔



۳۱۔ اگست۔ اس کی لاش مل گئی ہے اور پولیس قاتل کی تلاش میں ہے۔

یکم ستمبر۔ اس کے والدین مجھے ملنے آئے وہ رو رہے تھے۔  
۴۔ اکتوبر۔ قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یقیناً یہ کام کسی آوارہ گرد نے کیا ہوگا۔ ہونہ۔ اگر میں بتا ہوا خون دیکھ لیتا تو میرا خیال ہے میں اس وقت پرسکون نہ ہوتا۔

۱۸۔ اکتوبر۔ قتل کرنے کی خواہش میری ہڈیوں کے گوڈے میں برتی کر گئی ہے۔ یہ خواہش بالکل اس اشتیاق سے مشابہ ہے جو پچیس سالہ لڑکے کو عشق میں اذیت دیتی ہے

۲۵۔ اکتوبر۔ ایک اور۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد دریا کے کنارے گھوم رہا تھا کہ مجھے ایک ماہی گیر بلا جو بیت کے درخت تلے سویا پڑا تھا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا قریب ہی آلو کے کھیت میں ایک بلچہ زمین میں سیدھا گرھا ہوا تھا۔ جیسے اسی مقصد کیلئے وہاں رکھا گیا تھا۔ میں اُسے اٹھا کر واپس آیا۔ میں نے بلچہ ڈنڈے کی طرح اوپر اٹھانا اور اُسے اُسے میں اس کا سرتن سے جدا کر دیا۔ اس مرتبہ خون کی کچھ کمی نہ تھی سرخ خون جیسے میں مل گیا اور کچھ ہی دیر بعد آہستہ آہستہ بہہ کر پانی میں شامل ہو گیا۔ میں











ہی سمجھنے کے قابل نہیں۔

قاتلوں اور مجرموں کو ذہنی مریض سمجھ کر انہیں دماغی ہسپتالوں  
 میں علاج کے لئے بھیجا چاہئے۔ جیل خانے کی بھیاتک چار دیواری  
 میں بند کر کے انہیں مختلف اذیتیں پہنچانے اور آسائشوں سے محروم  
 کر دینے کے بعد مجرم آزاد انسانوں کے خلاف اپنے اندر نفرت کا  
 جذبہ تو پیدا کر سکتے ہیں مگر انسانی سماج میں ایک صحت مند ذہن  
 کے مالک انسان کی حیثیت حاصل کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔  
 نیز۔ اگر کسی انسان کو جان سے محروم کر دینا قتل ہے تو قاتل کی  
 جان لینا بذات خود قتل کر دینے کے مترادف ہے؟

کسی شخص کو قتل کرنا نہایت مجرم ہے لہذا قاتل کو پھانسی  
 پر لٹکا کر اسے قتل کرنا بھی انسانیت کی نظروں میں کم ہونا کا نہیں،



# سزائے موت

یہ افسانے اور کہانیاں نہیں بلکہ اس سرزمین کے لوگوں کی رائے ہے۔  
 جہاں علم تے پرورش پائی سائیس نے جنم لیا اور جہاں کا ہر انسان ہواؤں اور سمندروں  
 کو مستحکم کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ ہمارا ملک ان سے مختلف ہے جہاں کی ہر شے مستحکم  
 ہے مدت ہوئی کہ جہاں کی کوئی تہذیب تھی باقی رہا علم تو یہ ناگفتی ہے۔  
 سوال ملکوں کا نہیں بلکہ انسان کا ہے اور انسان من الحیث لا انسان اپنے  
 اندر کوئی امتیاز نہیں رکھتا وہ اپنے بگاڑ اور سنوار میں ایک سا ہے  
 اگر آج یورپ پر منح رہا ہے تو آئے لے کل کو مجھے بھی سوچنا ہے کہ انسانی دامن  
 پر اس دل کو آتی رہا اور باقی رہنے دینا ہے۔  
 پنجاب کا کوئی جیل خانہ ایسا نہیں جہاں کی مخصوص کوٹھڑیاں قاتلوں سے



بھری نہ ہوں حج ہر روز اپنا قلم توڑتے ہیں۔ پچانسی کا تختہ ہر روز کھلتا اور بند ہوتا ہے بلاد کی دوڑ دھوپ مدتوں سے جاری و ساری ہے۔

واقعات شاید ہیں کہ ہمارے ہاں بھی بنائے فساد زن اور زمین کے سوا

اور کوئی شے نہیں۔

تقسیم ملک کے بعد دیہاتی اور شہری آبادی کے پاس اسلحہ کی بہتات ہے گھر کے تمام فرد الگ الگ ریویو لٹکائے پھرتے ہیں لائسنس کے حصول کے لئے جو طریقے کچھریوں کے احاطہ میں استعمال کئے جاتے ہیں انہیں ان کیلئے رشوت سے بھی دور کا کوئی نام تجویز کرنا چاہئے۔

یہ بھی ایک سوال ہے کہ اسلحہ عام کیوں ہے ممکن ہے جو اب میں تلخی ہو لیکن بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر۔

پنجاب میں گزشتہ انتخابات کے بعد فریقین نے اپنے حاشہ برداروں کو اسلحہ کے لائسنس مہیا کئے۔ چونکہ مستقبل کو ان سے کام لینا ہے اس لئے ان کی ہر خواہش کا احترام کرنا ضروری خیال کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ شہر اور دیہات میں شریف اور غیر شریف کے درمیان اتیار اٹھ گیا۔ جن گاؤں میں کبھی کبھار جھگڑے ہوا اور ان کے درمیان لٹھیاں استعمال ہوتی تھیں۔ وہاں ریویو اور بند وقتوں کا کھلم کھلا استعمال ہوتا رہا ہے اگر کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کا ڈر نہ ہوتا تو میں بتاتا کہ ان جھگڑوں میں اکثریت ہنوز ایسے فسادات کی ہے جن کی بنیاد گزشتہ انتخاب اور اسلحہ کا عام ہونا ہے



برطانیہ کے عہد میں یہ قانون عام تھا کہ قتل کے مقدمہ میں اگر پولیس کو اپنی کامیابی کی امید نہ ہو تو سلطانی یا وعدہ معاف گواہ بنا کر اپنا کیس مضبوط کرتی تھی اس مال پر اصل ملزم بری کر دیا جاتا اور ترغیب دینے والا مجرم بنا کر پھانسی دے دیا جاتا۔ ہو سکتا ہے برطانوی عہد میں یہ رواج درست ہو لیکن جس ملک کی بنیاد (اسلامی تصور پر ہو۔ وہاں کے منصفوں کو انصاف کرتے وقت قتل کے مقدمہ میں (وعدہ معاف) کو نذر اندازت نہیں کرنا چاہئے۔

اسلام ترغیب دہندہ کو نہیں بلکہ قاتل کو سزا دیتا ہے اس لئے کہ قتل کے محرکات قاتل اور ترغیب دہندہ دونوں یکساں ہیں چنانچہ بلوچستان اور اس کی ریاستی یونین کے قبائلی لوگ اب بھی اسلامی رسم و رواج کے مطابق ایسے مقدمات کے فیصلے کرتے ہیں۔ گزشتہ سال :-

قبائلی سرداروں پر مشتمل ایک جرگہ نے ناظم ریاست قلات عبدالعزیز کے بھائی کے قتل کے الزام میں سردار شیردل خان مضمیری کو دو ہزار روپیہ جرمانہ اور باقی چار ملزموں کو پانچ پانچ سال قید با مشقت کی سزا دی ہے۔

سردار شیردل خان کے خلاف باقی ملزموں نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ سردار مذکور نے انہیں ناظم قلات عبدالعزیز کے بھائی کو قتل کرنے کی ترغیب دی تھی۔



آج ہمارے معاشرے میں دیگر جرائم کے ساتھ قتل کی وارداتیں اس حد تک ترقی کر چکی ہیں کہ عدالتیں سال ختم ہونے تک بھی ان مقدمات سے فارغ نہیں ہوتیں دیگر وجوہات کے علاوہ قتل عام کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وعدہ معاف گواہ کو مجرم ہونے کے باوجود انگریزی قانون گرفت نہیں کرتا اور جیل میں بھی اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔

میں برطانوی عوام کے ساتھ تو اتفاق نہیں کرتا کہ قاتلوں کو دماغی ہسپتالوں میں برائے علاج داخل کرنا چاہئے۔ لیکن اپنی حکومت سے یہ ضرور کہوں گا کہ ہمارے ملک میں ایسے قاتلوں کی اکثریت پھانسی چڑھائی جاتی ہے جو حقیقت میں قاتل نہیں ہوتے۔

قتل کے مقدمہ میں استغاثہ کی کہانی کا ہر کردار ذاتی اور خانگی انتقام کا منظر ہوتا ہے اس پر پولیس کی حاشیہ آرائی اس افسانے کو حقیقت بنانے میں معاون ہوتی ہے۔ اس بنیاد پر قانون جو عمارت استوار کرتا ہے عدالت اس پر اپنے فیصلے کی آخری ہرثیت کرتی ہے۔

سوال نہ عدالت کے فیصلے کا ہے اور نہ استغاثہ کی غلط یا صحیح کہانی کا۔

سوال رائج الوقت قانون کا ہے۔

عنوان بالا کے تحت تین بنیادوں پر تبصرہ ہے  
۱۔ بالخصوص دیہات میں اسلحہ کی بہتات۔



۲۔ سلطانی گواہ کو رعایت

۳۔ انگریزی قانون

اگرچہ ہمارے ملک میں قتل کی عام اور بنیادی وجہ ہمارے معاشرے کی خرابیاں بھی ہیں تاہم ہر سہ خرابیاں بنیادی خرابیاں ہیں جب تک پلٹ کر ہم ان پر غور نہیں کریں گے۔ یہ داغ بڑھتا ہی جائے گا۔

موت زندگی کے انجام کا دوسرا نام ہے۔ یہ معین وقت پر راستے کی تمام زنجیریں توڑ کر اپنے مقصود کو پہنچ جاتی ہے۔ ستاروں کی قندیلیں جل رہی ہوں یا بادلوں کے جھرمٹا نہیں اپنی لپیٹ میں لے چکے ہوں۔ چاند اپنی چاندنی کا چراغ لے کر کائنات کی منڈیر پر کھڑا ہو یا شبنم کی نمی سے اس کا دامن بھیگ چکا ہو۔ آفتاب کی تمانت تیز ہو یا شام اس پر اندھیرے کی چادر ڈال دے۔ موت کے معینہ وقت کے سامنے یہ سب افسانہ ہیں۔

سمندر کی گہرائی اور پہاڑوں کی بلندی انسان کو موت سے محفوظ نہیں رکھ سکتے؟

شاہی اور فقیری کے لباس موت کے ہاتھوں تار تار ہو کر رہ جاتے ہیں  
شہساز کا تخت اور فقیر کا تکیہ موت کے لئے دو نور استے ہموار ہیں  
اس کے قدم نہ رک سکے ہیں اور نہ انہیں فریب دیا جاسکتا ہے  
انسان کی منزل موت کے قریب سے شروع ہوئی ہے۔ اور قریب



جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

آئین فطرت اور قانونِ انسانی کے مابین ٹکراؤ کی ختم تاریخ کائنات کے پہلو پہ پہلو اپنے ذوقِ پلٹے جا رہی ہے۔ اس دوران انسان کبھی تو اپنے جرم کی سزا خود تجویز کرتا ہے اور کبھی قدرت اپنا فیصلہ دیتی ہے۔ انسانی سزا اور جزا دونوں دکھائی دیتے ہیں مگر قدرت کا فیصلہ سنائی نہیں دیتا۔ دیکھائی دیتا ہے۔

انسانی قتل انسانیت میں سب سے بڑا گناہ ہے چنانچہ خالق اور مخلوق دونوں نے قتل کی سزائیں مقرر کی ہیں لیکن انسان اس پر کب سے عمل پیرا ہوا۔ تاریخ کے کھنڈرات پر کھڑے ہو کر دور تک نظر ڈالنے پر ایسا کوئی نشانہ نہیں ملتا کہ زمانہ اور وقت کا تعین ہو سکے تاہم ابنِ آدم (قابیل) کو بحیثیت انسان کے مقتولِ اول ہونے کے اس کے باپ (آدم علیہ السلام) نے ملک بدر ہونے کی سزا دی۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں بقول ابنِ جبریل مقدس کے: خدا تعالیٰ نے قتل کی سزا کا تقرر فرمایا کہ ہر آدمی کے قتل کا انتقام آدمی سے لو لے گا۔ نیز جانوروں کے لہو پینے کی ممانعت فرمائی اور کہا جانور تمہارے کھانے کیلئے ہے۔ گوشت کے ساتھ ان کا خون تم مت پینا۔“

اس حکم خداوندی کے تحت قاتل کو سنگسار کیا جاتا تھا۔ پھر دوسرا زمانہ



آیا۔ کہ قاتل اور مقتول کی لاش دونوں کے منہ آپس میں باندھ دیئے جاتے تھے۔  
اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ قاتل مقتول کی لوت سے مر جاتا تھا۔ بنی اسرائیل کے عہد اقدار  
سے پیشتر مصر کے فرعون کے ہاں بھی قاتل کو سزائے موت دی جاتی تھی۔  
 موجب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ایک قبطی مر گیا۔ تو  
 فرعون نے حضرت موسیٰ کو گرفتار کر کے قتل کا حکم دیا۔ مگر وہ مصر  
 سے نکل گئے تھے۔

حضرت موسیٰ کے بعد جب بنی اسرائیل کا ستارہ چمکا اور مصر کی سرزمین  
 ان کے قدموں تلے روندی جانے لگی۔ تو حضرت یسوعؑ پہلے پیغمبر ہیں جنہوں  
 نے قاتل کے لئے پھانسی کا طریقہ جاری کیا۔ چنانچہ :-

”وقت کے بادشاہ کو حضرت یسوعؑ کے حکم سے درخت سے لٹکا

کر پھانسی دی گئی۔ اور اس کی لاش شام تک درخت سے لٹکی

رہی۔ سورج غروب ہونے کے بعد لاش کو اتار اور شہر کے پھاٹک

کی راہ گزر پر پھینک دیا گیا۔ اور بعد میں پتھروں سے چُن دیا گیا ہے۔

پھانسی دینے کا یہ طریقہ ایک مدت تک جاری رہا۔ مگر حضرت عیسیٰ کے عہد میں  
 بنی اسرائیل کے لئے حاکمین نے اس میں ترمیم کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو

(اپنی دانست میں) حسب ذیل طریق سے پھانسی دیا،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دونوں ہاتھوں میں کبیل ٹھونک ٹھونک دیئے گئے



اور سر پر کمانٹوں کا تاج پہنایا گیا ایک کیل کلچے کی جگہ اور  
گھٹنوں میں متعدد کیلیں ٹھونک گئیں۔ ان کے ساتھ دو اور  
ڈاکوؤں کو بھی اسی طرح مارا گیا۔“

انجیل مقدس کی زبان میں اس طریقے کو صلیب دینا کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس  
زمانے میں سزائے موت کا یہی رواج تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ رسم و رواج  
تبدیل ہوتے رہتے ہیں ہر حکمران اپنے عہد اقتدار کی نئی تاریخ مرتب کرتا ہے وقت  
اور زمانہ اس کے ہمراہ چلتے ہیں۔ وہ جو آئین وضع کرتا ہے۔ اقتدار شاہی کا امن  
اس کے پھیلاؤ میں اس کا معاون ہوتا ہے۔ دیباٹے و جملہ و نیل اور فرات کے کنارے  
گواہ ہیں کہ :-

”بنو امیہ اور بنو عباس نے اپنے عہد میں گناہ گاروں کو درختوں سے  
ٹسکا کر پھانسی کی سزا دی۔ سولی کا لفظ بھی انہیں کی ایجاد ہے چنانچہ  
لوہے کی پندرہ فٹ لمبی اور موٹی سلارخ ہوتی تھی۔ جس کا ایک سرا  
بجلی کے کھمبے کی طرح زمین میں گڑا رہتا تھا۔ اور دوسرا سوئی کی  
مانند باریک ہوتا تھا۔ پہلے اس پر کسی جانور کو ٹسکا کر دیکھتے ،  
دوسرے دن شہر میں سرکاری منادی کرائی جاتی کہ فلاں جگہ فلاں  
مجرم کو سزائے موت دی جائے گی۔ وقت پر عام لوگ جمع ہو  
جاتے تھے اور بادشاہ وقت کی موجودگی میں مجرم کو وہاں لایا جاتا



اور لوہے کی میٹھی کے ذریعے جو وقت پر کھینچے کے ساتھ لگائی جاتی تھی۔ جلد مجرم کو لے کر اس پر چڑھتا اور پیٹ کے بل اس کو لٹا دیا جاتا تھا۔ کھینچے کا باریک سرا مجرم کے گلچے میں سے ہو کر دوسری طرف نکل جاتا جس سے اس کی موت واقع ہو جاتی تھی۔“

اسلام نے جب اپنا مینی فیسلو دیا۔ اور بنی نوع انسان کے لئے طریق زندگی کی وضاحت کی تو اس میں قتل انسانی سے سختی کے ساتھ منع کیا اور تعزیر قائم کی :-

” اگر کوئی شخص کسی انسان کو اراداً گتوئیں میں دھکیل کر توحش میں یا دریا میں پھینک کر چاقو چھری گنڈاسہ اور لٹھ سے مار ڈالے تو مقتول کے قاتل یا قاتل کے ورثا سے قصاص لیا جائے جیسے مقتول کے ورثا پسند کریں نیز قصاص کی یہ صورت بھی تھی کہ اگر عورت نے عورت کو قتل کیا ہے تو عورت ہی قتل کی جاوے گی۔ اگر کسی آزاد مرد نے آزاد مرد کو قتل کیا ہے تو آزاد مرد کو ہی موت کی سزا دی جاتی تھی۔ جس کا طریقہ یہ تھا کہ ہاڈتوار سے لے کر قاتل کی گردن اڑا دیا تھا۔ اور یہ سب میں آج بھی جاری ہے جیسے کہ گذشتہ دنوں شاہ مین کے دونوں بھائیوں کو اپنے حقیقی بھائی کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں قتل کیا گیا۔“



قاہرہ ۱۷۰۵۔ اپریل۔ کل رات جو خبر یہاں پہنچی ہے یمن کے دو  
شاہزادوں سیف الاسلام اور ان کے بھائی عباسی کے سر حاجہ  
کے قلعہ میں قلم کر دیئے گئے ہیں

(رائٹر۔ امروزہ۔ ۱۸۔ اپریل ۱۹۵۵ء)

سلاطین عرب کے علاوہ ایشیائی ممالک نے بھی قتل کے مجرموں سے کوئی رعایت نہیں  
بھرتی خاص کر بھارت کے پرانے رسم و رواج میں جب کہ یہاں منوشاستری کی حکومت  
تھی قاتل کے لئے سزائے موت تو ہے لیکن اس کی کوئی واضح شکل نظر نہیں آتی  
اگر کوئی تھی تو اسے چندر گپت نے اپنے عہد کی یادگار کے طور پر منسوخ کر دیا تھا۔ اس  
سلسلے میں چندر گپت موریا کا اپنا فرمان جو اس نے موجودہ فیروز شاہ کوٹلہ میں بیٹھ  
کر دیا قابل توجہ ہے۔

”جو عہد مقررہ سے عدول کریں گے ان کے لئے جرمانے اور سزائیں  
بھی ہیں لیکن ارتکاب جرم کی نوعیت کے لحاظ سے سزا کی مقدار  
مقرر کی گئی ہے۔ مگر مرتکب جرم قتل کو قتل نہیں کروں گا۔ جو  
بدکار قتل کے مرتکب ہونگے وہ میرے رحم سے قطع و پدید اعضاء  
سے بچ جائیں گے۔ وہ خیرات دیں گے اور ان کو روزہ کا کفارہ  
بھی دینا پڑے گا۔“

(دار الحکومت جلد دوم صفحہ نمبر ۶۰۸)



اس کی تائید میں ایک چینی سیاح..... جو چندرگپت کے بعد میں بھارت  
آیا اپنے سفر نامہ میں اس وقت کے بھارت کی سڑاؤں کا ذکر کرتا ہوا۔ رسم  
طراز ہے :-

”ارتھکاب ہرم پر اکثر جہانے ہوتے تھے اور سڑاؤں موت قانوناً  
نہیں تھی۔ یادشاہ جہانی سڑاؤں کو نہ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ جو لوگ لغات  
پھیلانے کے سڑاؤں ہوتے صرف اتنی سڑاؤں پاتے کہ ان کا دایاں  
ہاتھ کاٹا دیا جاتا۔“

جانوروں کی قربانی بہت کم ہوتی تھی۔ گوشت صرف ایک قسم  
چھنڈل بیچتی تھی جب وہ بازار میں آئے تو اپنے ہاتھ سے دندے  
بچاتے تاکہ وہ کسی کو نہ چھو جائیں۔“

مگر جیسے ہی ہمارا جہ چندرگپت موریا اس جہاں سے رخصت ہوئے ایسے قوانین  
کی تمام کتابیں ان کے ہاتھ چٹا میں جلادی گئی۔ بعد میں آنے والے شہنشاہوں  
نے اپنے نئے نئے قانون مرتب کئے۔

”عہد عالمگیری میں پھر سے سلاطین عرب کے سے طریقے پرورش  
پانے لگے۔ گنگا کو سولی پر چڑھا کر اس کے پیٹ کو نیزے سے  
چیر دیا جاتا تھا۔ اور اس کی لاش تین دن تک سولی پر لٹکی رہتی  
تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔“



یہ طریقہ موت مغل سلطنت کے زوال تک جاری رہا۔ اٹھارویں صدی  
عیسوی کے برطانوی اور فرانسیسی دورِ حکومت میں قاتلوں سے وہی سلوک روا  
تھا جو ایشیائی اور عرب ملک میں رواج پاچکا تھا۔ آخر ۱۸۱۰ء میں لندن کے  
ایوانِ حکومت میں سر سموئل روٹلی کی آواز سے ایک گونج پیدا ہوئی کہ سزائے موت  
کو منسوخ کیا جاوے۔ دو بار انگلستان کی لہر اس آواز کو کیلے کے ساحل  
تک لے گئیں۔ فرانس ان دنوں تہذیبِ نو کے گہوے میں نہ صرف پرورش  
پا رہا تھا۔ بلکہ جوانی کی بہاریں اُسے یورپ کی تعیش پسند عناصر سے متعارف  
کر رہی تھیں۔ حسن پیرس گلیوں سے عشق کے بازار تک آچکا تھا کہ وکٹر ہیگنو (فرانس  
کا مشہور افسانہ نگار) گریو کے چوک (فرانس) کی وہ مشہور جگہ جہاں قاتلوں کو  
پھانسی دی جاتی تھی) میں کھڑا ہو کر لپکا اٹھا۔

جس شخص کو تم سزائے موت دیتے ہو۔ اس کے متعلق علی الصبح گل  
اور کوچوں میں اعلان کرتے ہو۔ اس کی سوانح حیات ..... جرم  
..... سزا۔ اور اس کی تکلیف کا اخباروں میں توسیع اشاعت  
کی غرض سے ذکر کیا جاتا ہے کسی خوفناک تجارت ہے وہ سکہ جو ایک  
ہاتھ پہنچتا ہے خون آلود ہوتا ہے۔

انتقام ایک انفرادی فعل ہے سزا کا اختیار صرف خدا کو ہے  
موسا بیٹی کا رابہ انتقام اور سزا کے درمیان میں سے ہے۔ سزا



اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے انتقام سوسائٹی کے شانِ شایاں  
 نہیں سوسائٹی کو انتقام کے لئے سزا نہیں دینی چاہئے بلکہ ایسے مجرموں  
 کی اصلاح کرنی چاہئے جو قتل کے مرتکب ہوتے ہیں سزائے موت  
 کو تم کس رنگ میں عملی جامہ پہناؤ اس کا وار صرف معصومیت پر ہوتا  
 ہے۔ کیونکہ جسے تم سزائے موت دیتے ہو وہ ایک خاندان رکھتا ہے  
 کیا اس صورت میں تم ایک انسان کو زندگی سے محروم کرتے ہو؟  
 نہیں۔ اسے موت کی سزا دیتے وقت تم اس کے افراد خاندان کے  
 سر آسمان امید پر ادیاری کے بادل پیدا کرتے ہو۔ اسی صورت میں تم  
 معصوموں کو سزا دیتے ہو اور معصومیت پھر تمہاری نوحہ خوانی کرتی ہے  
 ایسے مجرموں کو جلس دوام کی سزا دو۔ کیونکہ تنگ و تاریک کوٹھڑی  
 میں بھی وہ اپنے لواحقین کے لئے سامانِ زیست پیدا کر سکتے ہیں۔  
 لیکن وہ قبر کی گہرائیوں سے انکی معاونت کیسے کر سکتے ہیں؟  
 کیا تم ایسے وقت خوفزدہ نہیں ہوتے جب تم اس کے لڑکے  
 اور لڑکی کا خیال کرتے ہو؟  
 ان بچوں کا خاں خاں سے نہیں کاسہارا چھین لیا گیا ہے کیا تم محسوس  
 نہیں کرتے آئندہ پندرہ برس میں بیٹا جیل خانے میں ہوگا اور بیٹی  
 تعیش پسند امر کی نفسانی خواہش کے بچھونے کی زینت ہوگی۔



جن ممالک میں سزائے موت منسوخ ہو چکی ہے وہاں وارداتِ قتل

ہر سال کم ہوتی جا رہی ہیں۔ گزشتہ صدی سے سزائوں میں نرمی

کا دخل ہو چکا ہے۔ خونی سزائیں تقریباً منسوخ ہو چکی ہیں۔ اس غلام

عقل سزا سے فرانس کو بھی عنقریب نجات حاصل ہوگی۔“

لندن اور فرانس کے ادیب اور سیاست دانوں کی ان صدائوں نے نشیب و فراز یورپ

کو تہمت اور زندگی کے درمیان کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا قانون کے دروازے پر لا

کھڑا کیا۔ چنانچہ ۳۰ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو حکومت فرانس کے چیمبر میں جبکہ فرانسیسیوں نے

اپنے بطلِ عظیم نپولین کی لاش کو سر زمین فرانس میں دفن کیا سزائے موت کی

منسوخی پر بحث کا آغاز ہوا۔

اقرار اور انکار کے کئی برسوں کے بعد ۱۸۶۸ء میں انگلستان کے قانون میں

صرف اس قدر لغزش آئی کہ سر بازار پھانسی دینے کا رواج ختم کر دیا گیا اور ۱۹۳۲ء میں

قانون کی کمر در میان سے ٹوٹ گئی یعنی ۱۸ سال سے کم عمر کے بچے نیز حاملہ عورت

کو پھانسی دینے کی سزا منسوخ کر دی گئی۔ لیکن یورپ کے دیگر عوام نے اپنی حکومتوں

سے یہ حق منوالیا کہ قتل کے جرم میں سزائے موت منسوخ کر دی جائے۔

آج بلجیم۔ ڈنمارک۔ پرتگال۔ نیوزی لینڈ۔ ہالینڈ۔ لیتھونیا۔ ناروے۔

رومانیہ۔ سپین۔ سویڈن اور امریکہ کی اکثر ریاستوں میں یہ قانون ختم ہو چکا ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں امریکہ کو آج بھی جلا دکی تلاش ہے چنانچہ امریکن



سٹار نیوز ایجنسی کی ایک اطلاع ہے :-

نیویارک ۱۱ اگست ۱۹۵۳ء

دنیا کی ایک بھیانک ترین آسامی یعنی سنگ سنگ جیل کے جلاو کا

عہدہ اس وقت خالی ہے۔ ۵۴ سالہ جوزف فرانسس جو چودہ برس

تک اس عہدہ پر رہا ہے اور اس عرصہ میں دو سو تیس مجرموں کو

موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا ہے

روزنامہ احسان ۱۳ اگست ۱۹۵۳ء

۱۹۴۸ء میں پھر سے لندن کے دارالعلوم میں سزائے موت کی نسوخی پر بحث شروع

ہوئی اس موقع پر گیارہ افراد پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ جن میں دو ٹورٹیں تھیں

سزائے موت کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرنا کمیشن کا مقصد تھا۔ تقریباً چار

سال کی طویل تحقیق کے بعد ۱۹۵۳ء میں اس کمیشن نے پانچ سو ۵۰ صفحات پر مشتمل ایک

رپورٹ پیش کی جس پر حکومت کا سوادہ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ رپورٹ کا حاصل

یہ ہے :-

آئندہ جوری کو اختیار حاصل ہونا چاہئے کہ وہ وارداتِ قتل کی

وجوہات کی جانچ پڑتال کرے عدالت سے سزائے موت کی بجائے

صرف سزا کی سفارش کرے۔

جیسا کہ ۱۹۳۱ء میں طے پایا تھا کہ اٹھارہ برس سے کم عمر کے بچے کو



پھانسی کی سزا نہ دی جائے۔ کمیشن نے سفارش کی کہ اس عمر کو کم از کم اکیس سال کر دیا جائے۔

کمیشن نے قاتل کو کم سے کم وقت میں کم سے کم تکلیف کے ساتھ یقینی طور پر موت کی نیند سلا دینے کے طریقے پر بھی غور کیا۔ کمیشن کی رائے میں قاتل کو پھانسی پر لٹکانے کا موجودہ طریقہ سب سے زیادہ خاطر خواہ ہے۔ کمیشن نے قاتل کی خونی رگ میں نہایت زود اثر زہر کا ٹیکہ لگا کر ختم کرنے کے طریقے پر بھی سوچ بچار کیا۔

کمیشن نے امریکہ میں سزائے موت کے طریقوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ کمیشن نے ۱۹۳۲ء والی تجویز کو بھی رد کر دیا، کہ قتل کی مجرم عورتوں کو پھانسی کی سزا نہیں دینی چاہئے۔

اس رپورٹ پر ستمبر ۱۹۵۳ء میں دارالعوام میں بحث شروع ہوئی جس پر قدامت پسند اور لیبر پارٹی کے رہنماؤں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ اول الذکر جماعت کی رائے تھی کہ غلط رحم انصاف کو کمزور کر دیتا ہے۔ اور نظم و نسق میں بہت سی خرابیاں آجاتی ہیں۔ آخر الذکر جماعت کے رہنماؤں نے رپورٹ کے اکثر حصوں سے اختلاف کیا اور تجویز کی کہ کمیشن کی رپورٹ کے پیش نظر پانچ سال کے لئے سزائے موت کو منسوخ کر دیا جائے۔ فریقین کی بحث کے بعد یہ تجویز ۲۱۴ کے مقابل میں ۲۲۵ ووٹوں سے مسترد کر دی گئی۔

لندن کے اخبارات نے اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ سزائے موت کی بحث کے دوران میں اس سزا کے طریقے پر بہت کم غور کیا گیا۔



ان حالات کے بعد سکاٹ لینڈ کے چرچ نے برطانیہ کے تمام مذہبی اداروں سے اپیل کی، کہ وہ پھانسی کی سزا کو منسوخ کرانے کی مہم سے تعاون کریں۔ ہندوستان کی حکومت بھی سزائے موت کی منسوخی پر سوچ بچار کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں بھارت کی مرکزی حکومت نے تمام صوبائی حکومتوں سے دریافت کیا ہے کہ وہ گزشتہ دس سال کے حالات اور واقعات کے پیش نظر سزائے موت سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔

اسی سلسلے کی دوسری کڑی مشرقی پنجاب (بھارت) کے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات شری بی۔ سی۔ گٹونج نے انبالہ سنٹرل جیل میں قیدیوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

پھانسی اور عمر قید کی سزاؤں کو ختم کر کے طویل المیعاد سزاؤں میں تبدیل کرنے کا سوال حکومت ہند کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

سوویت یونین نے ۱۹۴۷ء میں تمام روس میں سزائے موت کو منسوخ کر دیا تھا۔ اور اس پر سوویت کمیونسٹ انجارات نے حکومت کے اس فیصلے کو اشتراکی انسانیت کا ایک عظیم کارنامہ قرار دیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں، اسکو ریڈیو نے ۱۹۵۵ء میں اعلان کیا کہ

آئندہ قاتلوں کو سوویت روس میں پھانسی دی جائیگی۔ ۱۲ جنوری ۱۹۵۵ء سے سزائے موت صرف ملک دشمن عناصر کو دی جاتی تھی۔ لیکن اب یہ سزا ان لوگوں کو بھی دی جائے گی جو دیدہ دانستہ قتل کے مرتکب ہوں گے۔ (رائٹرز لندن)



# سزائے موت کے طریقے

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کھانے والے ہندو پاک کے ہزاروں عوام کو انگریز حکمرانوں نے سربراہ درختوں سے لٹکا کر سزائے موت دی۔ یہ وہی پرانا طریقہ تھا جو تاریخ کے گذشتہ اوراق پیش کر رہے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے زندگی کے سال بڑھتے گئے قانونی طور پر موت کے طریقوں میں تبدیلی آتی گئی۔ سزائے موت کی موجودہ شکل انہی طریقوں کی سلجھی ہوئی تصویر ہے۔ ڈسٹرکٹ ججسٹریٹ قتل کے مقدمہ کی ابتدائی کارروائی سننے کے بعد ملزم کو پیش سپرد کر دیتا ہے۔ ملزم پر الزام ثابت ہو جائے تو اسے سزائے موت دی جاتی ہے۔ جیل والے ایسے مجرم کو جیل کی ڈیوٹی سے الٹی ہتھکڑی لٹکا کر پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیتے ہیں۔ گھر کے تمام کپڑے اتار کر جیل کا لباس پہنا دیا



جاتا ہے۔ اس کو ٹھہری میں مجرم کو کوئی ایسی چیز نہیں دی جاتی جس سے خودکشی کرنے کا امکان ہو۔

ہائی کورٹ — فیڈرل کورٹ — گورنر (سے رحم کی درخواست)۔  
ان جگہوں سے جب مجرم کے حق میں فیصلہ نہ ہو تو ہوم سیکرٹری (صوبائی گورنمنٹ) پھانسی کی تاریخ مقرر کرتا ہے۔ اور وہی مجرم کے گھردالوں اور حیل والوں کو اطلاع دیتا ہے تاکہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر کسی مجسٹریٹ کی ڈیوٹی لگا سکے۔ اور ساتھ ہی ساتھ سول سرجن کو بھی مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ پھانسی کے وقت موجود ہو۔

سزائے موت سے ایک دن پیشتر مجرم کو پھانسی کی آخری کوٹھڑی میں لایا جاتا ہے تاکہ وقت پر دوسرے مجرم اثر قبول نہ کریں۔ جیل ہسپتال کا ڈاکٹر مجرم کا وزن کرتا ہے۔ اسی قدر وزنی ریت کی بوری کو ریسے سے بانڈھ پھانسی والے تختہ پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ تاکہ ریسہ وقت پر گنہ گار کے بوجھ سے ٹوٹ نہ جائے۔ اس ریسے پر سپرنٹنڈنٹ جیل کے دستخط ہوتے ہیں تاکہ ریسہ تبدیل نہ کر دیا جائے۔

آخری دن شام سے ذرا پہلے مجرم کے ورثاء کو ملاقات کی عام اجازت ہوتی ہے۔ اس موقع پر تعاد کوئی سوال نہیں ہوتا۔

آخری رات مجرم کی دیکھ بھال میں قدرے اضافہ ہو جاتا ہے حتیٰ کہ حکام جیل رات کو وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔

سزائے موت کے اوقات موسم کے پیش نظر مقرر ہوتے ہیں۔ مثلاً



موسم سرما ہو تو رات کے دو بجے جیل ہیڈ وارڈر مجرم کو اس کی کوٹھڑی سے  
 اٹھی ہتھکڑی لگا کر غسل کے لئے صحن میں نکالتا ہے۔ اتنے میں ڈیوٹی محکمہ  
 سول سرجن۔ سپرنٹنڈنٹ جیل۔ داروغہ جیل۔ وارڈر اور نمبردار پہنچ جاتے  
 ہیں۔ غسل کے بعد گنہ گار کو سیاہ لباس پہنایا جاتا ہے۔ اور پھر اس کے  
 بازو اور ہاتھ اٹے باندھ دیے جاتے ہیں۔ اور اسے پھانسی کے تختے کی  
 طرف لایا جاتا ہے۔ اکثر مجرم ایسے موقعے پر قدم توڑ دیتے ہیں۔ لیکن اس پر  
 بھی قانون اپنا منشا پورا کرتا ہے۔

جب مجرم کو تختے پر کھڑا کرتے ہیں۔ تو ٹخنوں تک اس کے پاؤں باندھ  
 دئے جاتے ہیں۔ اس دوران۔ افسران مجرم سے باتیں کرتے رہتے ہیں  
 پھر بھنگی اس کے سر پر سیاہ ٹوپی پہناتا ہے۔ اور رشتہ اس کے گلے میں  
 ڈالتا ہے۔ مجرم کو اپنا منہ اور آنکھیں بند کر لینے کے اشارے کے ساتھ ہی  
 بھنگی تختے کا کانٹا کھینچتا ہے۔ جس سے مجرم دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے۔  
 تیس منٹ تک لاش بدستور لٹکی رہتی ہے۔ پھر نمبردار آگے بڑھ کر  
 لاش کو پھانسی کے رسے سے فارغ کرتے ہیں۔ اور لاش و رشاء کے سپرد  
 کر دی جاتی ہے۔

## پھانسی کی کوٹھڑی

پختہ اینٹوں والی سیمنٹ سے بنی ہوئی چھ فٹ مربع کوٹھڑی جس میں  
 مجرم کو سیشن کورٹ سے لے کر رحم کی درخواست تک بند رہنا پڑتا ہے۔



چاہے تین سال ہی کیوں نہ لگ جائیں۔

اس کو ٹھڑھی کے سامنے تقریباً دو فٹ چوڑا لوہے کی سلاخوں کا مضبوط دروازہ ہوتا ہے، جسے ہر وقت تالا لگا رہتا ہے۔ کو ٹھڑھی کے باہر اتنے ہی رقبہ کا صحن ہوتا ہے۔ بعض جیلوں میں یہ صحن چھت کے بغیر ہوتا ہے۔ اور بعض پر لوہے کے جنگلے لگے ہوتے ہیں۔ مگر ان کے باوجود لوہے کا مضبوط دروازہ اور تالا بھی لگا رہتا ہے۔

ہمہ اقسام کی یہ کو ٹھڑھیاں باقی مجرموں سے الگ ہوتی ہیں۔ ان کو ٹھڑھیوں کے لئے جیل وارڈروں کی گارڈا لگ ہوتی ہے۔ نوکری پر آنے والے ہر سپاہی کی تلاشی بڑی احتیاط سے لی جاتی ہے۔



# پھانسی کا تختہ

آٹھ فٹ مربع لوہے کے گارڈروں کا چوکھٹہ سا بنا ہوا ہوتا ہے۔ جس کے بالائی حصے پر دو فٹ کے فاصلے پر تین نشان ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان وقت ضرورت رشتہ باندھ دیا جاتا ہے۔ اس پر تین مجرم بیک وقت پھانسی پر لٹکائے جاسکتے ہیں۔

اس کے نیچے نو فٹ گہرائی ہوتی ہے جس پر شیشم کی لکڑی کے بوجھل تختے لگے ہوتے ہیں۔ یہ تختے عام طور پر مقفل رہتے ہیں۔ ان کے ایک طرف لوہے کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ جس کے وقت پر کھینچنے سے دونو تختے نیچے گر جاتے ہیں۔ اور مجرم دھڑام سے نیچے جا رہتا ہے۔

پھانسی کا رشتہ

بارہ فٹ لمبائی کا رشتہ دو اونچ موٹا ہوتا ہے۔ جس کے ایک سرے پر







دینے کے الگ وضع کئے جاتے ہیں۔ جبکہ امریکہ میں موت کے گھاٹ اٹارنے والے  
بلاڈ کو ایک سو پچاس ڈالر اجرت ملتی ہے۔ جسے وہ کم خیال کرتا ہے۔

---



یورپے میں

## سزائے موت کے طریقے

یورپ اور امریکہ میں سزائے موت کے مختلف طریقے رائج ہیں جن میں پھانسی پر لٹکانا بھی ہے، جیسے ہمارے ہاں رواج ہے۔

بجلی کی کرسی پر مجرم کو بٹھا کر اس کے سر اور ٹانگوں کے بال اتار دیئے جاتے ہیں۔ دھات کا ٹکڑا مجرم کے منڈے ہوتے سر پر اور دوسرا اس کی ٹانگوں پر باندھ دیا جاتا ہے۔ پھر بجلی کی تاروں کو ان دھات کے ٹکڑوں سے لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح بجلی مجرم کے سر سے پاؤں تک سرایت کر جاتی ہے۔ اگرچہ مجرم پہلے ہی جھٹکے سے ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم دل کی دھڑکن بند کرنے کے لئے بجلی کے مختلف جھٹکے دیے جاتے ہیں۔

مجرم کو ایک بند کمرے میں اس کے کپڑے اتار کر کرسی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کے دل پر ایک آلہ رکھتے ہیں (جسے سٹیموسکوپ) اس سے ڈاکٹر مجرم کی دل کی دھڑکن سن سکتے ہیں۔ اس کی ٹیوب کا دوسرا سرا ڈاکٹروں کے کمرے میں ہوتا ہے۔ جیسے ہی مجرم کا کمرہ بند ہوتا ہے۔ کرسی کے نیچے



رکھے ہوئے مختلف پیالے جن میں زہریلی دوائیں ہوتی ہیں خود بخود آپس میں مل جاتی ہیں جن کے اثرات سے زہریلی گیس پیدا ہوتی ہے۔ اور تین سے سات منٹ تک مجرم کا دم رگ جاتا ہے۔ دوسرے کمرے میں ڈاکٹروں کا فون میں سیٹھ سکوپ لگی ہوتی ہے۔ مجرم کے دل کی دھڑکنوں کی آواز بند ہو جاتی ہے۔

لندن کے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا ہے۔ کہ ٹیکہ لگا کر سزائے موت دینا

زیادہ بہتر ہے۔

کینڈا کی حکومت نے سزائے موت کے متعلق جو کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس نے حکومت کو مشورہ دیا ہے۔ کہ مارفیا کے انجکشن سے بہت جلد موت واقع ہو جاتی ہے۔ برطانوی رائل کمیشن نے سزائے موت کے لئے تجویز کیا ہے۔ کہ مجرم کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کرنا چاہئے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے برطانیہ کے لارڈ پادری ایک لٹپ نے کہا ہے۔ کہ یہ خودکشی کرنے کے مترادف ہے اور خودکشی گناہ ہے۔

## پھانسی دینے کے اوقات :-

انگریزی عہد میں سزائے موت دینے کے اوقات مختلف نہ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھار انگریز اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اپنے باغیوں کو سزائے موت دیتے وقت بے وقت ہو جاتا تھا۔ جیسے مارچ ۱۹۳۳ء میں بھگت سنگھ اور اسکے

ساتھیوں کو بعد از دوپہر چار بجے تختہ دار پر لٹکا دیا تھا۔ مگر عام رواج یہ تھا کہ سورج کی موجودگی میں یہ کیل نہ کھلا جائے۔ صبح آٹھ بجے تک قانون کا منشاء پورا ہو جاتا تھا لیکن جیسے ہی پاکستان میں نئے رواج نے ختم لیا۔ سزائے موت پانے کے لئے



بھی وقت کا تغیر بھی ضروری خیال کیا گیا۔ چنانچہ مروجہ آئین کے مطابق موسم گرما میں ساڑھے تین بجے صبح، سردی میں پانچ بجے صبح، موسم بہار میں ساڑھے چار بجے صبح، افسران متعلقہ قانون کا منشا پورا کر کے ان اوقات میں اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اس وقت تک جیل کی عام گنتی بند رہتی ہے۔

بہت برس ہوئے کہ پرانے رسم کے مطابق گناہگار کو عوام کے سامنے کھلے میدان میں سزائے موت دی جاتی تھی۔ تاکہ آئندہ جرم کرنے والے کو تنبیہ رہے۔ مگر بعض واقعات کی بنا پر یہ سارا نظام جیل کی چار دیواری میں منتقل کر دیا گیا۔

سزائے موت کے مجرم :-

جیسے کی مجرم کو کوٹھڑی میں بند کیا جاتا ہے اس کے گھر بلو کیڑے اتار کر جیل کا لباس پہنا دیا جاتا ہے۔ لیکن پاجامے کے لئے ازار بند نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ اس سے خودکشی کا احتمال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اور کوئی چیز گنہ گار کے پاس نہیں رہنے دی جاتی جس سے کوئی خطرہ ہو۔ دن کے کسی حصے میں چند ایک نمٹوں کیلئے گنہ گار کو کوٹھڑی سے باہر صحن میں چہل قدمی کے لئے نکالا جاتا ہے۔ ورنہ دونوں موسموں میں گنہ گار اسی مختصر کوٹھڑی میں موت کا منتظر رہتا ہے۔ اس کے لئے کسی فریجیئر کا انتظام نہیں ہوتا۔ سرکاری طور پر نہ ذاتی جہاں تک کہ مجرم کو اپنے مقدمے کے کاغذات دیکھنے پڑیں تو مہینوں اس کی درخواست دفاتر کے چکر میں گھومتی رہتی ہے۔ ایسے مجرم کے لئے اچھی تو راک کا کوئی انتظام نہیں۔ خوراک ایسی ملتی ہے جو عام قیدیوں کو دی جاتی ہے۔







# جرم

روحانیت سے تہی دامن انسانی ہاتھ جس بڑی طرح اخلاق کی دھجیاں بکھیرتا ہے۔ اور پھر اس پر انسانیت سے لا تعلق انسان تمدن کو ساخت کی بنیاد استوار کر رہا ہے اگر آدمی بذاتِ خود کوئی بڑی شے نہ ہوتا۔ تو خالق اور مخلوق کے مابین رشتے کی نوعیت بدل جاتی۔

زمانہ جس تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا ہے انسانی گناہوں کا شمار بھی اسی عجلت سے بڑھتا جا رہا ہے۔ غربت اور امارت کا یہاں امتیاز نہیں۔ دنیا کے نشیب و قرار میں بسنے والا ہر آدمی برائی کے رنگ و روغن سے متاثر نظر آتا ہے۔

شاہراہِ زندگی کی ہر خصلت سے انسانی نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ اور اسی چمک سے انسان ٹھوکر کھا کر منہ کے بل بڑی طرح گرا ہے۔ اور اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ اس کی منزلِ حیات کس قدر باقی ہے ہزاروں سال گزارنے کے بعد انسان ہنوز روزِ اول کی طرح اسی چمک میں کھل رہا ہے۔ جہاں سے حیاتِ نو اسے لے کر چلی تھی۔



تنزل کی اس قدر گہرائی میں پہنچ کر انسان آج اپنی ترقی کے راستے سوچ رہا ہے اسے اپنے قول و فعل میں تضاد نظر آتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے انسان اپنے قدموں پر واپس جانا چاہتا ہے۔ گو اس کے اپنے ہی گرد و نبال نے اس کا راستہ روک رکھا ہے۔ تاہم وہ اس کے لئے سوچ ضرور رہا ہے۔

۱۹۵۵ء کے وسط میں جینوا میں انسداد جرائم کے لئے قریباً ساٹھ ملکوں کے

نمائندے جمع ہوئے جن میں عدالتوں کے جج۔ پولیس کے سربراہ اور جیل خانیوں کے آفسر شامل تھے۔ جس میں امریکہ کے نمائندے نے کہا :-

”امریکہ کے اعداد و شمار کے بعد پتہ چلتا ہے۔ کہ نوجوانوں میں ۸ فیصد مجرم ایسے ہیں جو گھریلو حالات کی تلخیوں کے باعث جرائم کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں ایسے حالات میں امریکہ کے اندر ہر حال میں منٹ کے بعد ایک قتل اور ہر اڑھائی منٹ کے بعد ایک کار جلانی جاتی ہے۔“

پھارتی نمائندہ :-

”ہمارے ملک میں جرائم کی رفتار خطرناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ کلکتہ اور بمبئی جیسے

شہروں میں تو مجرموں کی باقاعدہ انجمنیں ہیں۔“

پاکستانی نمائندہ :-

”ہمارے ہاں بھی جرائم زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کی تہ میں نہایت بین کی آباد کاری کی خامی۔ رہائش کا مسئلہ۔ تعلیم کی کمی۔ اور اقتصادی وجوہات کار فرما ہیں۔“

لندن کی نمائندہ :-

”زیورچ یونیورسٹی میں قانون اور علم جرائم کے پروفیسر ڈاکٹر اردن فرسٹ“



نے جرائم کی تیزی کے سلسلے میں کہا۔ ہر شخص میں مجرم بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن ان کی اصلاح بھی کی جاسکتی ہے۔ منصفوں نے مجرموں کو اپنے زاویے سے سوچنا شروع کیا۔

امریکہ کے مشہور مصنف ڈاکٹر الیگزینڈر نیڈر کیمرے نے جرائم کا ارتکاب کرنے والے قیدیوں کے جیل کا معائنہ کیا۔ تاکہ ان مجرموں کے مسائل کی چھان بین کر سکیں۔ اور اندازہ ہو کہ آخر مجرم جرم کیوں کرتا ہے۔

ججوں نے اس پر مکالمے کیے۔ جیسے کہ نیویارک کی سپیشل کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر کوپرنے تحریر کیا ہے :-

”میں امریکہ کی معروف ترین عدالتِ جرائم کے بیچ کا چودہ سال تک رکن رہا ہوں۔ اس طویل عرصے میں میں نے پندرہ ہزار ایسے نوجوانوں کو مختلف سزائیں دیں جنہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ سزا بھگتے کے بعد ان نوجوانوں میں سے ساٹھ فی صد بدترین جرائم کے

مرتکب ہوئے اور ان میں سے بعض کا خاتمہ پھانسی پر ہوا۔ اگر میری عدالت اصلاح کے مناسب ذرائع بروئے کار لاسکتی تو مجھے یقین واثق ہے کہ ان بد نصیب نوجوانوں میں سے ۸۰ فیصد کو راہِ راست پر لایا جاسکتا تھا۔ یہی حالت دوسرے عدالتی بورڈوں کی ہے۔

اکثر رہنمایان قوم کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ مجرموں کو جیل میں بند کر دینا چاہئے۔ ان کی اصلاح کے لئے مرکز قائم کرنے ماہرین نفسیات کی خدمات حاصل کرنے اور اسی قسم کی دوسری ضرورتوں پر بے کار روپیہ خرچ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔



سالہا سال کے عملی تجربے سے ہم ججوں نے جو کچھ دیکھا ہے۔ وہ قومی رہنماؤں کے اس نظریے سے مختلف ہے ہمارے خیال میں ایسے نوجوانوں کو جنہوں نے زندگی میں پہلی بار جرم کیا ہو۔ بلا اقبیاز جیلوں میں ٹھونس دینے سے جرائم میں کمی کی بجائے انتہائی اضافہ ہوتا ہے جرائم کی تعداد میں روز بروز خطرناک حد تک اضافے کی وجہ صرف یہی ہے۔ کہ نئے مجرموں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ جو انہیں ہمیشہ کے لئے جرائم کی شاہراہ پر ڈال دیتا ہے۔

میری عدالت عام طور پر معمولی جرموں کے مقدموں کی سماعت کرتی تھی۔ ڈاکے، چوری اور قتل وغیرہ کے جرائم سے میری عدالت کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس لئے مجھے ایسے مجرموں سے یارہا واسطہ پڑا جو پہلی بار کسی جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ ان ہزاروں مجرموں میں سے ایک کی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جس کو سزا دینے کی بجائے اصلاح کی طرف مائل کیا گیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک کامیاب شہری ثابت ہوا۔

” ایک دفعہ میری عدالت میں چارلی نامی ایک اٹھارہ سالہ نوجوان کو پیش کیا گیا۔ عدالت میں داخل ہوتے وقت اس نے کسی نامی ڈاکو کی طرح اکڑا کر چلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے چہرے سے بدحواسی خیال تھی۔ اس کے پاؤں بڑھکڑا رہے تھے۔ اور بازو کانپ رہے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار قانون کا سامنا کر رہا تھا۔ گرفتاری پولیس کی تحقیقات۔ عدالت کی ابتدائی سماعت اور انجام کے خوف نے پریشانی کے بولقوش اس کے چہرے پر سبت کر دیئے تھے۔ ان سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ واقعی اسپنے کے پڑ پھتارہا ہے۔“

چارلی کے قبضے سے چوری کے آلات برآمد ہوئے تھے۔ اس پر یہ الزام عائد کیا



گیا تھا کہ یہ آلات چارلی نے خود تیار کئے ہیں۔ اور اُسے اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ ان آلات کو استعمال کرنے والا تھا۔ وہ بلاشبہ مجرم تھا۔ اور میں اُسے تین سال تک کی سزائے قید دے سکتا تھا لیکن میں نے اس کی اصلاح کرنے کی ٹھان لی چنانچہ میں نے اُس روز فیصلہ نہ سنایا۔

اس رات میں اپنے ذہن سے چارلی کو نکال نہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی نوئی چیز عذرتھی جس نے مجھے اصلاح پر مجبور کر دیا۔ میں اس بارے میں کافی دیر تک سوچتا رہا۔ اور بالآخر پولیس کو ہدایت کی کہ اس کے چال چلن کے بارے میں دوبارہ تحقیقات کرے۔ چارلی کی دوسری تحقیقاتی رپورٹ جب میرے پاس پہنچی۔ تو یہ ان صد ہا نوجوانوں سے مختلف تھی جنہیں میں مختلف جرائم کے ارتکاب پر قید و بند کی سزائیں دے چکا تھا۔ چارلی کا والد فوت ہو چکا تھا۔ چارلی کی محنت کش والدہ کو اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ چارلی کے محلے میں بعض عادی چور بھی رہائش پذیر تھے ان میں سے بعض چارلی کے گہرے دوست تھے۔ چارلی کے متعلق تحقیقاتی رپورٹ کے جس حصے نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ اس کی فنی اہلیت کے متعلق تھا۔ چارلی فطری طور پر مشینری کی طرف راغب تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے پرزے بھی تیار کر سکتا تھا۔ چارلی باقاعدگی سے کرج بھی جاتا اور مذہب کے لئے اس کے دل میں بے پناہ عقیدت تھی۔ اس قسم کے آدمی بہت کم حالات میں مجرمانہ زندگی اختیار کرتے ہیں۔

فیصلے کے روز میں بہت پریشان تھا۔ ہم حجوں میں سے اکثر کو اس امر کا پورا



احساس ہوتا ہے۔ کہ ہم لوگوں کی زندگیوں سے کھیلے ہیں۔ ہمیں اس بات کا تو پورا علم ہوتا ہے۔ کہ مجرم نے کون سا جرم کیا۔ اور اس کی کیا سزا ہے۔ لیکن ہم یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ کیا حالات تھے جس کے تحت کوئی مجرم کس جرم کا مرتکب ہوا۔ حالانکہ اس طرف اگر تھوڑی سی بھی توجہ کی جاوے۔ تو سزادوں لوگ قہر نزلت میں گرنے سے بچ سکتے ہیں۔

مجھے بخوبی علم تھا۔ کہ چارلی ایک دور رہے پرکھڑے ہے۔ میرے چند الفاظ اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے۔ کافی تھے۔ میں اُسے جرائم کی زندگی گزارنے پر بھی مجبور کر سکتا تھا۔ اور اُسے ان خوفناک گہرائیوں میں گرنے سے بچا بھی سکتا تھا۔ میں نے اس پر سر سے پاؤں تک نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور اُسے ایک موقع دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ میں اُسے مشروط طور پر رہا کر دیا۔ اور اس سے تین سال تک کی ضمانت نیک چلنی طلب کر لی اس کے ساتھ ہی میں نے پولیس کے آفسر کو اس پر نگرانی کے لئے مقرر کر دیا۔

چارلی کے نگران آفسر اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کے بعد ایک روز مجھے بتایا۔ کہ چارلی کی اصلاح بہت مشکل ہے۔ لیکن ہمیں ہالوس نہیں ہونا چاہئے مجھے یقین ہے کہ وہ راہ راست پر آجائیگا۔ ایک سال یونہی گزر گیا۔ چارلی کا نگران آفسر پھر میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اب وہ میرا دوست ہے وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم کامیابی کی جانب رواں دواں ہیں۔ چارلی اب ایک صنعتی سکول میں زیر تعلیم تھا۔ شام کے وقت وہ ایک دوکان پر شنیر سی کی مرمت وغیرہ کا کام کرتا ہے۔ اور اس قدر کمایتا جس سے



اس کی تعلیم اور والدہ کے اخراجات بخوبی پورے ہوتے۔ اب اس کی والدہ کو بھی  
 رذری کمانے کے لئے اتنی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ اور اب اسے اپنے بچوں کی  
 دیکھ بھال کے لئے کافی وقت مل جاتا تھا۔ چارلی کا ماحول بھی بدل چکا تھا۔ اور  
 اس نے جرائم پیشہ لوگوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لئے تھے۔ اب اسے  
 ذیل کاموں کے لئے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

جو نوجوان زندگی میں پہلی بار جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہیں عام طور  
 پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلی قسم کے مجرم وہ نوجوان ہوتے ہیں۔ جو حوادثِ زمانہ کا شکار ہو کر اپنی  
 راہ کھو بیٹھے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بڑی آسانی سے راہِ راست پر لاٹے جاسکتے  
 ہیں۔ لیکن جب وہ ایک دفعہ جیل کا چکر لگا آئیں تو پھر ان کی اصلاح ناممکن  
 ہو جاتی ہے۔

دوسرے قسم کے لوگ: مجرمانہ ذہن۔ خانگی مشکلات اور مجرمانہ کاموں کے  
 زیر اثر جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس قسم کے مجرموں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی  
 ہے۔ اس قسم کے مجرموں کی اصلاح کا واحد ذریعہ ان سے ہمدردی کا اظہار انکی  
 رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہے۔ ہماری کمزوری اس قسم کے مجرم ہیں۔ ہم ایسے مجرموں  
 کی کثیر تعداد کو جیلوں میں ٹھونس دیتے ہیں۔ ان کی اصلاح و بحالی کے لئے کچھ بھی  
 نہیں کرتے۔

تیسری قسم کے لوگ دوسری قسم کے مجرموں سے بہت حد تک ملتے ہیں لیکن  
 ان میں فرق یہ ہوتا ہے کہ تیسری قسم کے لوگ رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں



ان سے اگر ذرا بھی نرمی یا مہربانی سے سلوک کیا جائے تو وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

مکن ہے کسی دن کوئی ماہر نفسیات ان کی اصلاح کا بھی کوئی حل تلاش کرے اور معاشرہ کو ان بدترین دشمنوں سے نجات مل سکے۔ اس قسم کے مجرموں کیلئے مناسب ترین جگہ جیل خانہ ہے۔

ہر چھ ماہ مجھے "نائٹ پروسیس کورٹ" میں چیف جسٹس کے ذریعہ انجام دینے پڑتے ہیں۔ میرے پاس مجرموں کی طرف سے ہزاروں درخواستیں آتی ہیں۔ کہ انکی ضمانت نیک چلنی کی مدت کم کر دی جائے۔ میں ان میں سے اکثر کی درخواستیں منظور کر لیتا ہوں لیکن اس قسم کا فیصلہ مکمل تحقیقات کے بعد ہی کرتا ہوں۔ اور انہیں عدالت میں بلا کر کہتا ہوں۔ تم مجرم تھے! تمہیں گرفتار کیا گیا! اور عدالت تمہیں جیل بھیج سکتی تھی!!! لیکن تمہیں نیک چلنی کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا!!! آج تم مجھ سے درخواست کرتے ہو کہ نیک چلنی کی اس ضمانت کے عرصہ کو بھی کم کر دیا جائے۔ میں تم پر اعتماد کرتا ہوں۔ اب تم اپنے جرم کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہو اور تم نے شر لیانہ زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ کہ تم نے اپنی مشکلات پر قابو پا لیا۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہنا چاہتا اب تم ایک اچھے شہری بن کر دکھاؤ۔ سچ مجرموں کی حالت پر رحم کھا کر ان کی..... سزائیں کم کر دیتے ہیں یا معاف کر دیتے ہیں۔ یہ رحم دراصل ان مجرموں پر نہیں کھایا جاتا بلکہ معاشرہ کی حالت زار پر کیا جاتا ہے عام لوگوں کو بھی اس مسئلہ میں گہری دلچسپی لینی چاہئے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہئے کہ آیا ایسی عدالتوں اور عملہ کا انتظام ہے، جن میں پہلا جرم



کرنے والوں کی اصلاح اور دیکھ بھال کا کوشش کی جاتی ہو۔

ہیں اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ روہانی کمزوری جو لوگوں کو مجرم بناتی ہے اس کو صرف جیلوں میں ٹھونسے اور جرمانے عائد کرنے سے دور نہیں کیا جاسکتا۔

(نوائے وقت ۱۲ ستمبر ۱۹۵۲ء)

اس تحریک کے اثرات ججوں اور مصنفوں کے ذہن سے نکل کر آہستہ آہستہ ایوان حکومت میں پھیل رہے ہیں۔ ارباب اقتدار نے قانون کے اس باب کا مطالعہ پھر سے شروع کیا اور جیل خانوں کی محدود دنیا میں پرورش پانے والے عوام کو ایک ایسی نظر سے دیکھنے لگے ہیں کہ جیسے وہ انہی کے ہم جنس تھے۔ لیکن آج وقت نے انہیں ناموافق حالات کے پیش نظر مجرم اور انہیں قانون کا محافظ بنا دیا ہے چنانچہ جیلوں کے نظام میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ ظلم کی جگہ مروت نے آگے بڑھ کر ان مجرموں کو خوش آمدید کہا جنہیں کل تک سلاج نے راستے کا روڑہ سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا۔

چنانچہ برطانوی جیلوں کے کمیشن کو اختیار دیا گیا ہے۔ کہ ویسٹ مور لینڈ میں ولنٹروپ (VALINROPE) اور جنوبی لنکن شائر میں ولینگور (VALINGORE) کے مقام پر دو اور جیل خانے بنائیں جو آہنی سلاخوں اور روایتی جنگلوں کے لہجے میں۔

ان گھگھے جیل خانوں میں قیدیوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائیگی اور ان کی نفسیاتی اصلاح کی غرض سے ان پر زیادہ سے زیادہ اعتماد اور اختیار پر زور دیا جائے گا۔ ان نئے اداروں میں دو سو قیدیوں کو رکھا جائے گا۔



ان کا انتخاب ایسے قیدیوں میں سے کیا جائیگا جو پہلی مرتبہ جرم کے مرتکب ہوئے ہوں۔  
اس سے قبل جو ایسے ادارے بنائے گئے۔ کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ نیز ان  
کے ذریعہ میں اپنے والے عوام کو ان قیدیوں سے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں ملا۔  
لیکن اس کے برعکس مغربی پاکستان کے جیل خانوں میں ہنوز وہی دھماچو کڑی  
پچی ہوئی ہے۔ جیل حکام کی فرعون مزاجی میں سرسوز فرق نہیں آیا اگر انہیں اسکے  
لئے باقاعدہ ٹریننگ دی جائے تو ممکن ہے حالات اس سے مختلف ہوں جیسے  
بھارت گورنمنٹ نے کیا۔

لکھنؤ کے جیل ٹریننگ سکول میں جیل کے پندرہ آفیسروں کو قیدیوں کیسا  
بتاؤ گرنے کے لئے سائنٹفک (Scientific) تربیت دینے کا کام  
شروع کر دیا ہے۔

سکول میں جیلوں کے عملے کو ایسی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ جیلوں کے  
اندر قیدیوں سے ان کے ضروری مسائل..... جرائم کی روک تھام اور  
انتظام کے متعلق سائنٹفک تربیتی رویہ اختیار کر سکیں۔

(روزنامہ احسان ۴ جون ۱۹۵۳ء)

لیکن ہمارے ہاں تعلیم سے فارغ ہوتے ہی نوجوانوں کو بلا کسی تربیت کے  
جیل حکام میں شامل کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شب و روز قیدیوں  
اور افسروں کے درمیان ہنگامہ آرائی رہتی ہے۔

(۲) پاکستان سے باہر کی دنیا نے جیل خانوں کو نئے سرے سے آراستہ کیا ہے  
اپنے ملک کے قیدی کے ذہن سے یہ احساس چھین لیا ہے کہ وہ قیدی ہے چنانچہ



جاپان کے جیل خانوں میں قیدی (Telecommunication) دیکھتے ہیں۔  
 نظمیں لکھتے اور انگریزی پڑھتے ہیں۔ وہاں تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے۔ قیدی  
 بیٹے میں دو مرتبہ سینما دیکھتے ہیں۔ ان کے رشتہ دار ہر روز ان سے ملاقات  
 کر سکتے ہیں۔  
 روزنامہ آفاق ۱۵ نومبر ۱۹۵۵ء

قاہرہ، حکومت کے اس فیصلے کے بعد کہ مصر میں قیدیوں کو بیڑیاں پہنانے  
 کا رواج ختم کر دیا جائے۔ آج سے مصر میں قیدیوں کی زنجیریں اتار دی گئیں  
 مصر کے وزیر جنگ اور افواج مصری کے کمانڈر انچیف عبدالحمید نے آج جیل  
 جاکر خود قیدی کی زنجیر کھولی۔ آج رات مصر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قیدیوں کو قلم  
 شورو کھائے جائیں گے

روزنامہ امروز ۱۲ فروری ۱۹۵۵ء

مصر کی مشہور قلم سٹار اور رفاہیہ طاہیہ نے کل قاہرہ کے جیل خانہ میں اپنے  
 ساتھیوں کو ایک شاندار پارٹی دی۔ انہوں نے باہر سے کافی چیزیں منگوائیں اور  
 انہوں نے جیل کی کوٹھڑی میں دوسرے قیدیوں کو بھی مدعو کیا۔ اس تقریب کے موقع  
 پر انہوں نے اپنے رقص کا مظاہرہ کیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر یہ رقص قید خانے  
 سے باہر ہوتا تو قیدی تو درکنار عام لوگ بھی نہ دیکھ سکتے۔ کیونکہ اس کے لئے  
 انہیں بھاری فیس ادا کرنی پڑتی۔

طاہیہ پر کمیونسٹوں کے لئے کام کرنے کا الزام ہے ابھی ان پر مقدمہ نہیں  
 چلایا گیا۔ انہیں حال ہی میں اپنی پر رونق قیام گاہ سے گرفتار کر کے قید کیا گیا ہے  
 مذکورہ تقریب کی وجہ یہ تھی کہ جیل میں ایک خاتون کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا۔  
 (سٹار لندن ۴ جنوری ۱۹۵۵ء)



مگر پاکستان کے جیل خالوں میں قیدیوں کو ایک جگہ مجتمع ہو کر عیدین کی نماز اور دوسرے مذہبی تہواروں کی ادائیگی میں بھی اہنی دیواریں حائل ہیں۔ شاید دیگر ممالک کی اہنی سہولتوں کو دیکھ کر ڈاکٹر جگن سالیق وزیر اعظم نے کہا تھا۔

”یہ حقیقت ہے کہ جیل فراغت کیلئے عمدہ جگہ ہے۔“

رائٹر تسنیم ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء

(کنگ) ضلع جیل کے قیدیوں نے بطور ریڈیو آرکسٹرا کے ریڈیو اسٹیشن پر میوزک اور فوق ڈانسوں کے پروگراموں میں حصہ لیا۔

پروگراموں کا افتتاح کرتے ہوئے نائب وزیر داخلہ نے کہا کہ یہ اقدام اصلاحات کے سلسلہ میں ہے جو قیدیوں کے سدھار کے لئے کی جا رہی ہے۔ بیکانیر جیل میں قیدیوں نے خود اپنی عدالت قائم کی ہے تاکہ جیل کے اندر قانونی خلاف ورزیوں کا افساد کیا جائے۔

یہ عدالت آٹھ چھوٹی پر مشتمل ہے۔ جو سب کے سب اقلیتی ہیں سپرنٹنڈنٹ جیل عدالت کے صدر ہیں۔ حج جن مقدمات کے فیصلے کرتے ہیں صدر ان کی تصدیق کر کے ان پر عمل گراتے ہیں۔

مترائے موت کے مجرم جنہیں موت کے انتظار میں پھانسی کو ٹھہری ہینوں بلکہ برسوں گزارنے پڑتے ہیں جن دشواریوں سے دست و گریبان ہوتے ہیں یہ وہی جانتے ہیں انہیں چند لمحوں کے سوا ہر موسم کے شب و روز محققہ کو ٹھہری کے طول و عرض میں بسر کرنے پڑتے ہیں۔



مقدمہ کے دوران ایسے مجرموں کو کوئی ایسی سہولت نہیں دی جاتی کہ وہ تسلی بخش طریقہ سے اپنے مقدمہ کی پیروی کر سکیں۔

انہیں برائے مطالعہ کوئی ایسا لٹریچر بھی نہیں کیا جاتا کہ وہ اپنی آخرت کے متعلق فکر کر سکیں۔

انہیں سزائے موت ملنے کے بعد بہتر خوراک نہیں دی جاتی۔

انہیں عزیز اقارب سے ملنے میں وہ آزادی نہیں جو ایسے مجرموں کو غیر مالک نے دے رکھی ہے۔

یورپ کے جیل خالوں میں سزائے موت کے مجرموں کو تمام سہولت دی جاتی ہیں۔ جیسے کہ مسٹر وائٹ جیمین جسے اکیس ۳۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو پھانسی دی جانی تھی اپنے بیان میں کہتا ہے :-

”میں نے موت اور قانون کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی پھانسی کو ٹھٹھی کو ایک اچھے خاصے وکیل کے دفتر میں تبدیل کر دیا۔ قانون کی بیسیوں کتابیں ٹائپ رائٹر اور کلغزوں کا انبار منگوا لیا۔ ان کی روشنی میں زندگی اور قانون کی جنگ کا اعلان کر دیا۔“

مجھے ان کتابوں کے مطالعہ پر ۳۰۰۰ ہزار گھنٹے صرف کرنے پڑے۔

قانونی رسالوں سرکاری ریلوے قانونی دستاویز کے مطالعہ پر ۲۰۰

ہزار گھنٹے صرف کئے۔ اس طرح میں نے قانون کو موم بنا لیا۔ سرکاری

وکیلوں کو تلخی کا ناچ چایا۔ مجھے جیل سے عدالت تک بیسیوں دفعہ

آنا جانا پڑتا تھا۔



جس دن مجھے پھانسی ملنی تھی۔ اس سے گیارہ روز قبل میری دوسری کتاب شائع ہو چکی تھی۔ جسے ایک فلم کمپنی نے پچیس ہزار پونڈ میں خرید لیا۔ اس تمام کروکاوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجرم جسے اکتیس جولائی کو سزائے موت ملنی تھی۔ اس کی اپیل تیس جولائی کو منظور ہو گئی اور وہ بری کر دیا گیا۔

برطانیہ کے ایک شخص مسٹر ماٹن جسے ۱۹۵۳ء میں سزائے موت ہوئی۔ اس کا کہنا ہے جیل کے دو محافظ میری نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے اس نگرانی کو جیل کی زبان میں موت کی نگرانی کہتے ہیں۔ میرے محافظ باری باری ڈیوٹی بدلتے۔ وہ بڑے بہیمان اور میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ بعض اوقات اپنی بیویوں کی طرف سے مجھے تحفے بھی لاکر دیتے تھے۔

میرے دل کے بہلانے کو تاش اور شطرنج کھیلنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ میری کوٹھڑی کے سامنے ہر صبح وارڈ پرہیز کرتے تھے جس سے میری دلچسپی قائم رہتی۔



# نابالغ مجرم

تقسیم ملک سے پیشتر نابالغ مجرموں کے لئے دہلی میں ریفارمیٹری کا انتظام تھا  
بوسٹل جیل لاہور کے بعد بچوں کی اکثر تعداد وہیں رکھی جاتی تھی۔ کم سے کم تین سال وہاں  
گزارنے کے بعد بہت کم مجرم ایسے ہوتے جو پھر سے جرم کا ارتکاب کرتے۔

دہلی ریفارمیٹری کی تربیت حکام کا سلوک بچوں کو والدین کی محبت سے بے

نیاز کر دیتا تھا۔ پاکستان میں اس قسم کا کوئی ادارہ ہنوز قائم نہیں ہو سکا۔

امریکہ آج دنیا کے تمدن مالک کی صفِ اول میں شمار ہو رہا ہے لیکن نو عمر  
مجرموں کا مسئلہ وہاں کے حکمران لوگوں کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں  
خصیہ پولیس کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کا خلاصہ طالع :-

”چار لاکھ پتیس ہزار لڑکے اور لڑکیاں جرائم کے سلسلہ میں عدالتوں کے

سامنے پیش کئے گئے۔“

یورپ کے دیگر ملک بھی اسی طرح نو عمر مجرموں کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کے سامنے



سپر انداز ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے عدالتوں کا انتظام الگ کرنا پڑا۔  
ہالینڈ نے سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں نوعمر مجرموں کے لئے ایک انجمن کی بنا  
ڈالی۔ ۱۹۳۲ء میں برطانیہ نے ایک قانون وضع کیا جس کی رو سے نوعمر لڑکے اور  
لڑکیاں دوسرے مجرموں سے الگ رکھے جاتے تھے۔

اطلی کے وزیر داخلہ نے اگست ۱۹۴۹ء میں آوارہ نوعمروں کی دیکھ بھال کے لئے  
ایک خاص پولیس کا دستہ قائم کیا۔

دی آنا قانون کے مطابق چودہ سال سے کم عمر مجرموں کے مقدمات پولیس کی  
امداد کار خواتین کرتی ہیں۔

اسرائیلی حکومت میں چودہ سال سے کم عمر کے مجرم کو ہتھکڑی نہیں لگائی  
جاتی اور نہ ہی تصاویر یا انگلیوں کے نشان لئے جاتے ہیں۔

یکسٹریکٹ میں نوعمر مجرم کو گرفتار کرتے وقت پولیس وردیاں نہیں پہنتی۔  
برطانیہ میں مجرم بچوں کی گرفتاری عام طور پر زنانہ پولیس کے ذریعے عمل میں  
لائی جاتی۔ فرانس میں پولیس کو ہدایت ہے کہ وہ نابالغ مجرم کو ہتھکڑی مجبوراً  
حالت میں لگائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مغربی ممالک نے اپنے عدالتی انتظام بھی نوعمر مجرموں  
کے لئے الگ کر رکھے ہیں۔ برطانیہ میں ایسی عدالتوں کے کمرے عام عدالتوں سے  
الگ ہوتے ہیں۔ یہ اگر ممکن نہ ہو تو پھر یہ عدالتیں ان دنوں کام کرتی ہیں جیسا  
دوسری عدالتیں بند ہوں۔

فرانس میں ۱۹۴۵ء سے ایسا ہی رواج قائم کیا گیا ہے۔



اسرائیل میں نو عمروں کے مقدموں کی سماعت بند کمروں میں ہوتی ہے۔  
 سویڈن میں اٹھارہ سال سے اکیس سال تک لڑکے لڑکیوں کے مقدمات  
 کی دیکھ بھال ایک عوامی ادارہ کے سپرد ہوتی ہے۔  
 ڈنمارک میں نو عمر مجرموں کے مقدمات کی دیکھ بھال کرنے والے عوامی اداروں  
 کے ممبر کا انتخاب بلدیہ کے ووٹر کرتے ہیں۔

تمام مغربی ممالک میں نو عمر مجرموں کے لئے جیل خانوں کا نام تربیتی یا اصلاحی  
 جیل خانے ہیں ان کی تمام تربیت اسکولوں جیسی ہے۔ اب ان جگہوں کا نام  
 بھی ٹریننگ سلول رکھا گیا ہے۔ وہاں کے ماہرین کا کہنا ہے :-  
 ”ان اسکولوں نے بڑی ترقی کی ہے اور ابھی بہت سی ترقی کی گنجائش ہے“  
 گو غیر ممالک کی دیکھ دیکھی پاکستان گورنمنٹ نے جون ۱۹۵۵ء میں اعلان کیا تھا۔  
 جو گیارہ جون کے اخبارات میں شائع ہوا۔

مرکزی حکومت نے بارہ لاکھ روپے کے خرچ سے ایک ٹریننگ ہاؤس اور  
 ہوسٹل انسٹیٹیوٹ جس میں تقریباً ۶۸۰ نو عمر بچوں کے رہنے کا بندوبست ہوگا۔  
 جہاں انہیں مختلف پیشوں کی تربیت دی جائے گی۔  
 اس میں سزایافتہ اور زیر سماعت مقدمات کے مجرموں اور مضموموں کیلئے  
 الگ الگ بلاک ہونگے لڑکیوں کے بلاک ہوگا۔  
 اس میں سکولوں، ہسپتالوں، کھیل کے میدانوں اور مختلف پیشوں کی تربیت  
 دی جائے گی۔

حکومت کے اس اعلان کو ملک کے عوام نے بڑی گرمجوشی سے پڑھا اور



اس پر روزنامہ روز کا ادارہ بہت پسند کیا گیا۔

بلوغت سے پہلے ہی نہایت سنگین جرائم کے ارتکاب کا مسئلہ معاشرت اور نفسیات کے ماہروں اور قید خانوں کے حکام کے غور و فکر کا ایک قدیم موضوع ہے۔ علوم کی ترقی نے کم سن مجرموں کی اصلاح کے پروگراموں میں بڑی گنجائش پیدا کر دی ہیں۔ اقوام متحدہ نے بھی دنیا کے قریب قریب تمام ممالک میں ان مجرموں کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ اور بعض ایسی تجاویز پیش کی ہیں کہ اگر ان پر نہایت التزام سے عمل کیا جائے۔ تو انہی مجرموں کو سزا بھگتنے کے دوران میں پر امن اور مفید شہری بنایا جاسکتا ہے۔ اور یوں نہ صرف ان خاص افراد کی زندگی تباہی سے بچ سکتی ہے۔ بلکہ اس اصلاح سے پورا معاشرہ اور اس معاشرے کا مستقبل متاثر ہوتا ہے پاکستان میں کم سن مجرموں کو سزا تو ضرور دی جاتی ہے۔ مگر ان کی اصلاح کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ حالانکہ ان مجرموں کے ذہنوں میں اس تصور کا پیدا ہونا ہی خطرناک ہے کہ وہ سزا بھگت رہے ہیں یہ تصور انہیں منتقم مزاج اور ہندی بنا دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں نہ صرف وہ عمر بھر جرائم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ نہ ہر سارے معاشرے میں سرایت کرتا۔ اور پھیلتا رہتا ہے۔ خوشی کی بات ہے۔ کہ اب حکومت پاکستان نے کم سن مجرموں کی تعلیم، تربیت اور پرورش کی طرف متوجہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور کراچی میں ایک بورڈل انسٹیٹیوٹ قائم کی جانے والی ہے جس میں ۶۸۰ مجرموں کی جدید سائنٹفک طریقوں سے تعلیم کا انتظام کیا جائے گا اور انہیں مختلف مفید پیشیوں کی تربیت دی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت نے اس سکیم کے متعلقہ تقاضوں پر بھی غور کر لیا ہوگا۔



# مغربی پاکستان کے جیل

قیام مغربی پاکستان سے پہلے پنجاب میں بیس کے قریب جیل خانے تھے اور آج بھی ہیں جن میں قریباً بیس ہزار آدمی روزانہ اپنے جرموں کی پاداش میں سزائیں بھگت رہے ہیں۔ مغربی ملک کے جیل خانوں کے مقابل پاکستان کے یہ جیل خانے جہنم کہہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ حکومت پاکستان نے اپنی تغافل شعاری پر کئی بار افسوس کیا جیسے کہ جینیوا کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے پنجاب کے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات مسٹر جی ایم سعید نے کہا

مجرموں کو نئے طریقوں سے سزا دینا اور انہیں جیلوں میں رائج کر دیا گیا ہے لیکن پاکستان کے جیل خانوں میں ابھی تک کسی قسم کی اصلاح نہیں کی گئی۔ پاکستان میں بھی وہ طریقے نہایت خوبی سے چل سکتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ جیلوں میں گنجان آبادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اور مزاجات بھی پہلے کی نسبت



کم ہو جائینگے۔

اگست ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ اسمبلی کے ممبر سٹرا ایم. دھیر (کانگریسی) ایک غیر سرکاری قرار داد پیش کرتے ہوئے کہا

حکومت جیلوں کی اصلاح کی طرف مناسب توجہ نہیں کر رہی۔ اس محکمہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ قیدیوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے ابھی تک کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا حکومت کو اس مسئلہ پر انسانی نکتہ نظر سے غور کرنا چاہئے اور ایسی تدبیر اختیار کرنی چاہئے کہ قیدی ملک کے اچھے شہری بن سکیں۔

حکومت پنجاب نے ۱۹۵۳ء میں جیلوں کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے ۱۹۵۳ء میں ایک سو اٹھارہ صفحات پر مشتمل رپورٹ حکومت کو پیش کی جن میں سے کچھ کی منظوری صوبائی حکومت نے دی۔

۱۔ قیدیوں سے چکی پلینے، بان بٹنے اور دیگر سخت کام نہ لے جائیں  
۲۔ قیدیوں سے صنعتی کام لے جائیں۔ جو ہائی کے بعد انکو روزی کمانے میں  
مرد دیں۔

۳۔ ایسے قیدیوں کو جو کسان طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ جدید اصولوں کے طریقے سے زراعت کی تربیت دی جائے۔

۴۔ قیدیوں کو احساس کمتری سے بچانے کیلئے اچھا لباس پہنایا جائے۔  
جہاں تک جیلوں میں سخت مشقت کا تعلق ہے متحدہ پنجاب کے وزیر جیل خانہ  
لالہ بھیم سین مچرنے ان کا خاتمہ ۱۹۴۶-۴۷ء میں کر دیا تھا۔ البتہ حکام جیل قیدی کو  
بطور سزا کے چکی پلینے کی سزا دیتے تھے۔



اپریل ۱۹۵۵ء میں اقوام متحدہ کی تنازات علم الجرائم پر غور کرنے کے لئے پاکستان کے جیل خالوں کے انسپکٹر جنرل کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر جیل خانہ جات چوہدری علی اکبر نے کہا :

پنجاب کی جیلوں میں بہت سی اصلاحات کر دی گئی ہیں۔ قیدیوں کو اچھی طرح خوراک ہنسی کی جاتی ہے اور انہیں پہلے کی نسبت بہتر ماحول میں رکھا جاتا ہے تاہم مقامی جیلوں میں اب بھی مزید اصلاحات کی ضرورت ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ ہم نفسیاتی امور میں جدید ترین سائنسی تحقیقات سے استفادہ کریں اور قیدیوں کو مریض سمجھ کر ان کا نفسیاتی علاج کریں جیلوں میں چھوٹے پیمانے پر صنعتیں قائم کی جائیں جو قیدی کو مطلوبہ تنخواہ ادا کریں۔

انہی دنوں وزیر جیل خانہ کے پارلیمانی سیکرٹری نے ایوان حکومت میں ایک بیان دیا۔ سٹرل جیل (لاہور) میں قیدیوں سے ملاقات کے لئے خاص کمرے کا انتظام کیا گیا ہے جس میں بیچ اور میزیں موجود ہیں۔ ان کمروں میں قیدی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ پہلو پہلو بیٹھ سکتے ہیں۔

ورنہ جیلوں میں عام رواج تھا۔ کہ قیدی اور ملاقاتی کے درمیان لوہے کی جالی ہی حائل رہتی تھی۔

بعض جیلوں میں دکانوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ جہاں سے قیدی اپنی روزانہ ضرورت کی اشیاء خرید سکتے ہیں۔

قیدیوں سے عام سلوک بہتر ہو گیا ہے۔ اسی اجلاس میں حکومت سے ایک سوال کیا گیا۔



کیا حکومت جیلوں میں بید زنی کی سزا ختم کرنے کی تجویز کر رہی ہے۔

جواب وزیر اعلیٰ نہیں  
پارلیمانی سیکرٹری کے بیان کا متن صرف اتنا ہے کہ لاہور سنٹرل جیل میں واقعی  
دکانیں اور ملاقات کے کمرے الگ کر دیئے گئے ہیں پنجاب کی دیگر جیلوں کی باری کب  
آتی ہے؟

آہ کو چاہئے ایک عمر اثر ہونے تک  
حکومت کے ان اعلانات کو مغربی پاکستان کے اخبارات نے بہ نظر اطمینان  
دیکھا نیز مختلف عنوانات کے تحت ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔  
پاکستان کے وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں اعتراف کیا ہے کہ جیلوں کے نظم و  
نسق کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ جیلوں کو تعزیری خالوں کے بجائے اصلاحی اداروں  
میں بدلنا ضروری ہے تاکہ جیل جانے والے اچھے شہری بن سکیں اور جیلوں سے  
باہر آئیں تو ملک کی معاشرتی بہتری میں حصہ لے سکیں انہوں نے یہ بھی بتایا  
کہ یہ مسئلہ حکومت کے زیر غور ہے۔

جیلوں کی اصلاح کا یہ وعدہ یقیناً خوش آئند ہے لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت  
اصلاحات کو رائج کرنے کے سلسلے میں کونسا ڈھب اختیار کرے گی۔ قیدیوں کی  
زبوں حالیوں کی کیفیت کن ذرائع سے معلوم کریگی۔ اور جیلوں کے عملے کی ذہنی  
اصلاح کا ایسا کونسا طریقہ رائج کریگی۔ جس سے وہ سزا کے تصور کو اصلاح میں  
بدل سکیں۔ دراصل جیلوں کی اصلاح کے سلسلے میں اب تک جو اصلاحی  
اسکیمیں تیار ہوئی ہیں ان میں قیدیوں کے بجائے قید خالوں کے منظم حضرات



زیادہ دخل ہوتا ہے اور حکومت بھی اصلاحات کے سلسلے میں سب سے پہلے  
 انہیں سے مشورہ ضروری سمجھتی ہے۔ حالانکہ قیدیوں کی حالت کو قیدیوں سے بہتر  
 کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اور جل کا سٹاف ان کی ضروریات کے متعلق غلط نقطہ نظر  
 قائم کرنے پر محض اس لئے مجبور ہے کہ وہ قیام پاکستان سے پہلے کا یہ فرانس انجام  
 دے رہا ہے۔ اور انگریزوں اپنے ملک کے قیدیوں کے لئے اصلاح کی خوبصورت  
 تجاویز پر عمل کر رہا تھا۔ غلام ملک کے قیدیوں کو مصلحتاً ذلت اور بستی کے سوا  
 اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ ملک کی اکثریت کو جاہل رکھنے اور آزادی کے جذبات  
 پر پیرے پٹھائے رکھنے کے پس پردہ اس استعماری اور استبدادی حکومت کے  
 جو مقاصد تھے۔ وہ سب پر ظاہر ہیں اور جیلوں کو گناہ اور جرم کے اندھیرے میں  
 پٹے رکھنے کی روایت بھی غیر ملکی حکومت کی اسی ناپاک اسکیم کی ایک ضروری شق  
 تھی۔ ہمارے جیلوں کا پرانا اسٹاف اسی قدیم نظم و ضبط کے اصولوں پر عمل کر رہے  
 اور ان پر کامل یقین رکھتا ہے۔ وہ اصلاح کے روپ میں اپنے اختیارات کی شکست  
 دیکھنے لگتا ہے۔ اور حکومت کو چند ایسے اصلاحی اقدامات کا مشورہ دیتا ہے جو ممکن ہے  
 کاغذ پر تو طے حسین معلوم ہوں لیکن زیر عمل آنے سے قیدیوں کی بد نصیبی میں کوئی کمی  
 پیدا نہیں کر سکتے اور ان کے ساتھ غیر انسانی طرز سلوک کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے  
 قید خانوں کو تھر نر خانے بنائے۔ ان امور تاریخ انسانی کے ابتدائی اور متوسط  
 دور سے تعلق رکھتا ہے ہندو دنیا نے اپنے ہاں کے مجرموں کو ان کی مجبوریوں کے  
 پس منظر میں دیکھا شروع کیا۔ تو جیلوں کے مروجہ نظام میں اصلاحیں ہونے لگیں  
 اور اب تو دنیا اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ ہر مجرم اپنے ماحول کی کسی نہ کسی خرابی



کی وجہ سے مسلمہ اخلاقی اقتدار کی حد بندیاں توڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چور یا ڈاکو غنڈہ ہو یا قاتل اس کے تہذیب دشمن عمل کے پس پردہ اس کے معاشرتی حلقے اور اسکی ذہنی تعمیر کی پوری تاریخ کار فرما ہوتی ہے اور اگر علم معاشرت اور علم نفسیات کے ماہرین کو ان عوامل کے تجزیے پر مقرر کیا جائے اور اس طرح ان کے نتائج کی روشنی میں ایک سائنٹیفک اصلاح کی اسکیم مرتب کی جائے۔ تو یقیناً ہمارے سوسائٹی کے یہ بدنصیب لوگ جیلوں میں نہرا بھگتے اور اپنے غلط یقینوں میں مرصوب و ترہونے کے بجائے اپنے آپ کو سمجھانے پر قادر ہو سکیں گے۔ اس میں انہیں یہ یقین دلانا بہت ضروری ہوگا۔ کہ انسان فطرتاً اوباش۔ بد معاشر اور غلبیظ نہیں اور بنیادی طور پر انسان شریف اور عظیم ہے۔ جب تک انسان کو اپنی عظمت اور کارگاہے جہاں میں اپنی اہمیت کا احساس نہیں ہوگا وہ اول تو بزدل اور پست رہے گا۔ ورنہ مجرم بن جائے گا۔ اور ہمارے جیل خانے اسے عادی مجرم بناتے رہنے حتیٰ کہ وہ ہمیشہ کے لئے سماج کی گندگیوں کے ڈھیر میں ایک بریکار چھڑے کی طرح جاگرے۔

ہم وزیر داخلہ کو مشورہ دینگے کہ جیلوں کی اصلاح ایک بڑی اخلاقی مہم ہے جس کے لئے حکومت کو عام انداز سے ہٹ کر بہت گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے اصلاحات کی اسکیم مرتب کرنے کے لئے حکومت کو جیل اسٹاف کے بجائے ملک کے پڑھے لکھے طبقے کا تعاون حاصل کرنا چاہئے جو اپنے نظری اور عملی علم کو بھی بروئے کار لائے۔ اس سلسلے میں قیدیوں کے حالات بخشم خود دیکھنا۔ اور ان سے بات چیت کرنا بجز ضروری ہے۔ اسکیم کے مرتب ہونیکے بعد جیل کے اسٹاف کو



ذہنی طور پر ان اصلاحات کو قبول کرنے کے لئے تیار کرنا۔ اس مہم کی پہلی شق ہوتی چلے بسے بصورت دیگر اصلاحات کی کامیاب سے کامیاب اسکیم بھی عملی صورت میں ناکام ہو کر رہ جائیگی اور اس کے الفاظ بندالماریاں میں رکھی ہوئی فائلوں ہی میں چمکتے رہ جائیگی۔

مشرقی پاکستان اسمبلی میں ایک کانگریسی رکن نے ایک قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق قیدیوں سے سلوک اور جیل خانوں کے عام نظم و نسق میں اصلاح کی جائے قرارداد میں جیلوں کے حالات کا جائزہ لینے اور اصلاح احوال کے لئے سفارشات پیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی کے تقرر کا مطالبہ کیا گیا ہے وزیر جیل خانہ جات نے اس مطالبے کا یہ جواب دیا کہ مرکزی حکومت کے زیر اہتمام مختلف صوبوں کے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کا ایک اجلاس کراچی منعقد ہوا تھا جس میں جیل خانوں کی اصلاح کے ذرائع کا جائزہ لینے کے بعد اصلاح احوال کے لئے سفارشات پیش کی گئی تھیں۔ یہ سفارشات اب حکومت کے زیر غور ہیں۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کی یہ کانفرنس فروری ۱۹۵۷ء میں منعقد ہوئی تھی اور اس کے بعد غور و خوض کا ذکر بھی وزیر موصوف نے ضرورتاً ہی کیا ہے اگر اسمبلی میں یہ قرارداد پیش نہ ہوتی۔ شاید اس کی کبھی نوبت ہی نہ آتی۔

قیدیوں کی اصلاح اور دیگر مسائل اسانی مسئلہ ہے۔ اس میں تاخیر و تعویق کو کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قید و بند سے صرف مجرموں کو ہی دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ بلکہ بسا اوقات ایسے لوگوں کو مختلف وجوہ کی بنا پر جیل جانا پڑتا ہے جن کو "جرم" کے تحت شمار نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس بات سے پیشتر لوگ اتفاق کرینگے



کہ قید خانہ میں جرم کی نوعیت اور قید کی وجوہ کی بنا پر کوئی تمیز و تفریق روا نہیں رکھی جاتی۔ سب کو ایک ہی لاکھی سے ہانکا جاتا ہے بعض اوقات سیدھے سادھے لوگ بھی جیل سے رہا ہونے کے بعد "ولایت پلٹ" مجرم بن جاتے ہیں۔ جیلوں کی حالت کے بارے میں مختلف لوگوں نے وقتاً فوقتاً جو تاثرات و خیالات پیش کئے ہیں وہ ایسا اوقات اتنے گناوتے ہوتے ہیں۔ کہ ان پر سرسری نظر ڈالتے ہی انسان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات تصور ہی میں نہیں آسکتی کہ اس ماحول میں کچھ دن بسر کرنے کے بعد کوئی انسان اس کے گناوتے اثرات کو قبول کرنے سے محفوظ رہ سکتا ہے قید کا مقصد تخریر کے ساتھ اصلاح بھی ہوتا ہے قید خانہ کے انتظام میں بھی ان امور میں ہم آہنگی ہونی چاہئے بلکہ اصلاح کے پہلو کو زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہئے۔

اس وقت بھی جیلوں کے حالات کا معائنہ کرنے کے لئے غیر سرکاری ارکان کی کمیٹی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کمیٹیوں کی رکنیت صرف اعزاز اور نمائش تک محدود ہے اگر ان کمیٹیوں کے ارکان اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے اور معائنہ کے اغراض و مقاصد کے مقتضیات کو پورا کرتے تو انسپٹر جنرل کی سفارشات ابھی تک زیر غور نہ رہیں بلکہ اب تک ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کسی اقدامات ہو چکے ہوتے۔

حکومت کو قیدیوں کے مسئلہ پر انسانی نقطہ نظر سے غور کرنا چاہئے۔ قیدی کو راہ گم کردہ انسان سمجھ لیجئے یا معاشرہ کے لئے خطرناک۔ لیکن تخریر کے ساتھ اصلاح کے امکانات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ عبرت اور انتقام میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس وقت جیل خانوں میں انتقام کا پلہ بھاری ہے اصل ضرورت عبرت اور اصلاح کا پلہ بھاری کرنے کی ہے۔



ہمارے ہاں ابھی جیلوں میں قیدیوں کی نگہداشت کے متعلق جدید تصورات اختیار نہیں کئے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جیل کی سختیوں اور صعوبتوں میں یقیناً کمی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جیلوں کے نظم و نسق میں اور قیدیوں کی دیکھ بھال کے متعلق جدید تصورات کو ضوابط میں بھی مناسب جگہ دی جائے۔ جیلوں کے متعلق جدید تصور یہ ہے کہ جو لوگ معاشرہ کا کوئی قانون توڑنے کے مرتکب ہوں۔ ان کو معاشرہ سے الگ کر دیا جائے۔ تاکہ معاشرہ ان کے مزید شر سے محفوظ رہے اور اس علیحدگی میں ان کی ایسی ذہنی اور نفسیاتی تربیت کی جائے کہ جب وہ معاشرہ میں واپس جائیں۔ تو وہ ایک قانون پسند شہری ہوں۔

ہمارے ہاں قیدیوں کی مشکلات اور مصائب کے متعلق عوام میں زیادہ تر اطلاع سیاسی قیدیوں کی وساطت سے پہنچتی ہیں اس لئے عمومی توجہ سیاسی قیدیوں کے حالات و کوائف تک محدود رہتی ہے۔ اور دوسرے یعنی اخلاقی قیدیوں کا مسئلہ توجہ کا مرکز نہیں بن سکا۔ گذشتہ سال کے اواخر میں رنگون میں اس مسئلہ کے متعلق ایشیائی ممالک کی ایک کانفرنس بھی ہوئی تھی۔ جس میں حکومتوں کے سامنے بعض اصلاحی تجاویز کی سفارش کی گئی تھی۔ مرکزی حکومت کو اس کی رپورٹ موصول ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ کو نہ صرف شائع کیا جانا چاہئے کہ عوام میں اس مسئلہ کے متعلق دلچسپی پیدا ہو بلکہ ان سفارشات کو عملاً نافذ کرنے کی بھی تدبیر کرنا چاہئے۔

جیلوں کی اصلاح پر غور کرنے کے لئے پاکستان میں جیلوں کے اعلیٰ احکام کی پہلی کانفرنس ۱۹۵۱ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اب ایک ایسی ہی کانفرنس لاہور میں ہو رہی ہے جس کا افتتاح کرتے ہوئے۔ جیلوں کے صوبائی وزیر نے بتایا ہے کہ اگرچہ پنجاب کی



جیلوں کے نظم و نسق میں بہت سی اصلاح کر دی گئی ہیں۔ لیکن ابھی مزید اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا کہ مجرم دراصل ذہنی مریض ہوتا ہے اس لئے اس کا نفسیاتی علاج ہونا چاہئے اس مقصد کے لئے ایسے سرکاری حکام مقرر ہونے چاہئیں جو انسان دوست ہوں اور اصلاح کے شدید جذبے کے تحت کام کریں قیدیوں کو امداد دینے والی سوسائٹی کو قیدیوں کے معاملات میں زیادہ دلچسپی دینی چاہئے اور بعض چھوٹی صنعتوں کو جیلوں میں منتقل کر دینا چاہئے جہاں قیدی مزدوری کریں۔ اور باقاعدہ اس کی اجرت حاصل کریں۔ جیلوں اور قیدیوں کی اصلاح کے سلسلے میں یہ سب تجاویز یقیناً خوش آئند ہیں۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ وزیر موصوف نے کسی تدارک کی تجویز کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ سب سے زیادہ اس امر پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ مجرمانہ ذہنیت پیدا ہی نہ ہونے پائے اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں۔ جن میں جرم کی طرف کسی کی طبیعت رجوع ہی نہ کر سکے۔

اقوام متحدہ کے زیر اہتمام قیدیوں کی اصلاح کا جائزہ لینے والوں نے بھی اس بات پر زور دیا ہے۔ کہ مجرموں کے علاج سے زیادہ پرہیزی تدابیر پر عمل کرنا ضروری ہے۔ تاکہ مجرموں کی تعداد کم سے کم رہے۔ اس بنیاد پر قیدیوں کی اصلاح کی تدابیر سوچنا کہ جیلوں کو تو بہر حال قیدیوں سے ہمیشہ بھرے رہنا ہوگا۔

ہنایت غلط تصور ہے اور سب سے پہلے اس کی اصلاح ضروری ہے اسکے ساتھ قیدیوں کی اصلاح کی ہم جاری رکھی جاسکتی ہے۔ اس کے تحت قیدیوں کی رہائش، خوراک، ورزش، طبی امداد، تنظیم، بیرونی دنیا سے تعلق اور مطالعہ وغیرہ کی مشقیں ہیں اور قیدیوں کے ساتھ جیلوں کے حکام کے برتاؤ کا اہم معاملہ



ہے۔ بہر کیف خوشی کی بات ہے کہ ارباب اختیار گذشتہ آٹھ برس میں دو مرتبہ تو جیلوں اور قیدیوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ۱۹۵۱ء میں جو اصلاحات نافذ ہوئی تھیں۔ انہیں جیل کے اکثر سرکاری حکام اور اہل کاروں نے محض اس لئے سخت ناپسند کیا تھا کہ ان اصلاحات میں قیدیوں کے ساتھ ذرا سے شریفانہ سلوک کا پہلو نکلتا تھا۔ اور اہلکار قیدیوں کے ساتھ انسانی برتاؤ کے عادی نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ یہ اصلاحات نیم دلی سے نافذ کی گئیں۔ اور یہ اب تک ناممکن صورت میں نافذ ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ چار روزہ کانفرنس ان تمام مسائل پر غور کرے گی اور اگر اس نے مزید اصلاحات کا کوئی فیصلہ کیا تو ایسے انتظامات بھی کریں گی کہ ان اصلاحات پر پوری طرح عمل بھی ہو اور اہلکاروں کی ذہنیت میں بھی تبدیلی پیدا ہو۔ کیونکہ جس طرح مجرم ذہنی مریض ہوتا ہے۔ اسی طرح مجرم کو حیوان سمجھنے والے بھی ذہنی نفسیاتی علاج کے محتاج ہیں۔

پنجاب میں عرصہ سے پرزور زاید سوسائٹی قائم ہے جس کے مقاصد یہ ہیں۔  
 قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو قانون کا احترام کرنا سکھایا جائے اور وہ بھی کچھ اس انداز سے کہ پرامن شہری بننا ان کے لئے باعث مسرت ہو۔  
 جرائم کی تکرار کو روکا جائے اور جیلوں کو برسر روزگار ہونے میں مدد دی جائے۔

قیدیوں کے اہل و عیال اور جیلوں کے اندر خود قیدیوں کی امداد کی جائے۔ اور جن رہا شدہ قیدیوں کا کوئی گھر نہیں۔ انہیں برسر کار ہونے تک کریک ہوم



میں رکھا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقاصد نہایت نیک ہیں اور اگر ان پر باقاعدگی سے عمل کیا جائے تو قیدیوں کی بد حالی اور جرائم کی رفتار کو خاصی حد تک روکا جاسکتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ گذشتہ سات برس میں اس سوسائٹی نے قیدیوں کو قانون کا احترام سکھانے کے سلسلے میں کیا کچھ کیا ہے۔

کتنے سال قیدیوں کو پر امن شہر لوہوں کی حیثیت سے آباد کیا گیا ہے۔

قیدیوں کے اہل و عیال کی امداد پر کتنی رقم صرف ہوئی۔ اور اس عرصہ میں ان سال قیدیوں کی تعداد کتنی ہے جنہیں برسر کار ہونے سے پہلے کر ایک ہوم میں رکھا گیا۔

ظاہر لوہوں معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی بھی قابل ذکر کام نہیں ہوا اگر کچھ ہوا ہوتا۔ تو سوسائٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے حالیہ اجلاس میں اس کا ذکر ضرور ہوتا بہر حال اگر گذشتہ سات برس میں کچھ نہیں ہو سکا۔ تو اس غفلت پر پچھتانے یا کسی کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے بنیادی کام یہ ہے کہ اب کچھ کرنے کا عزم کیا ہے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ سوسائٹی کی مجلس منتظمہ کے فیصلوں میں سرگرمیوں کی تجدید کے ارادے جھلک رہے ہیں۔ سوسائٹی اپنی اضلاعی شاخوں کو سرگرم کرنا چاہتی ہے صوبائی اور اضلاعی کونسلوں کے قواعد اور آئین میں بعض مفید ترامیم پر غور کر رہی ہے امید کرنی چاہئے کہ سوسائٹی محض نام کی سوسائٹی کے کردار کو چھوڑ کر اس میدان میں وسیع اصلاحی پروگرام شروع کرے جو حکومت اہل ثروت اور خدمت خلق کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔



ترقی یافتہ ملکوں میں جیل خانوں کے اصلاح خانے بنا دیئے گئے ہیں۔ اور جیلوں کا ماحول تربیتی مراکز کے ماحول میں بدل گیا ہے۔ جہاں عادی مجرموں کا نفسیاتی علاج کیا جاتا ہے۔ رہائی کے بعد قیدیوں کی اقتصادی خود کفالت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ انہیں مختلف ہنر سکھائے جاتے ہیں اور یہ لوگ جب جیلوں سے باہر آتے ہیں۔ تو ان کی دنیا بدل چکی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ملک کے قید خانوں کا ماحول نہایت خوفناک ہے۔ یہاں تعلیم و تربیت کے بجائے دھونس اور دہشت سے کام چلایا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجرم جیل کے اندر نئے نئے جرائم سیکھتا ہے اور اس کی ذہنیت بالکل مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔

جن قیدیوں کے اہل و عیال کی امداد کو یہ موزوں نہایت ملخ ہے۔ جب ہنگامی قوانین کے تحت گرفتار کئے ہوئے سیاسی کارکن فیملی الاؤنس سے محروم رہتے ہیں۔ تو اخلاقی قیدیوں کے بارے میں اس قسم کی بات سوچتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے۔

پاکستان کے قید خانوں اور قیدیوں سے سلوک کے طریقے کار میں ہمہ گیر اولہ دور رس اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اور اگر پرنسز ایڈ سوسائٹی چاہے تو اسکی سرگرمیاں ان اصلاحات کی بنیاد بن سکتی ہیں۔

پنجاب اسمبلی میں ایک مرتبہ پرنسز ایڈ سوسائٹی کے فیصلوں میں طویل تاخیر کا مسئلہ سامنے آیا ہے۔ اور وزیر اعلیٰ نے یقین دلایا ہے کہ حکومت اس بات کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ کہ جن قیدیوں کے مقدمات کے فیصلے نہیں ہوئے ان کی کارروائی بلا تاخیر مکمل ہونی چاہئے۔ جن کی وجہ سے جیلوں میں گنجائش پر بہت زیادہ



بار پڑا ہے۔ اور غیر صحت مند حالات پیدا ہوئے ہیں۔

زیر مقدمہ قیدیوں میں سب سے قابل رحم حالت ان کی ہوتی ہے جن کو ماتحت عدالتوں سے موت کی سزا سنائی گئی، اور انہوں نے اس کے خلاف اپیل کی ہوتی ہے۔ موت کی سزا سنائے جانے کے ساتھ ہی انہیں خاص کوٹھڑیوں میں مجبوس کر دیا جاتا ہے اور جب تک اپیل کے مختلف مراحل کے بعد کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ انہیں زندگی میں موت کی آغوش میں رہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اپیل کے فیصلے میں دو چار ہفتے نہیں لگتے۔ اکثر اوقات سال سے بھی زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے اور اس دوران قیدی وہ زندہ درگور کی کیفیت سے دو چار رہتے ہیں۔ ایک طرف ان کے سروں پر موت کا سایہ منڈلاتا رہتا ہے۔ دوسری طرف گرب ناک ماحول میں قید اور وہ بھی کئی ماہ تک ان کے لئے موت سے بھی زیادہ دردناک سزا کے مترادف ہوتی ہے اس سلسلہ میں نہ صرف قوائد و ضوابط میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ بلکہ مقدمات اور اپیلوں کے جلد از جلد فیصلوں کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

(۶) لاریب آج بنی نوع انسان اپنی روحانی کمزوریوں سے تائب ہو کر معصیت کے خارزار راستے سے دامن زندگی سنبھالتا ہو اصرارِ مستقیم کی طرف مڑ رہا ہے یورپ اور ایشیا کے حکمرانوں کو اپنے آئین و ضوابط میں تبدیلیاں کرنی پڑیں اور انہیں محسوس ہوا کہ انسان سے گناہ ہو سکتا ہے اس کے پائے استقلال میں لغزش آسکتی ہے۔ لیکن یہ مرض لاعلاج نہیں اور اس کے لئے حکومتوں نے اپنے خزانوں کے دروازے کھول دیئے اور ایسے حکیم تلاش کئے جو مریض سے نہیں بلکہ مرض سے گفتگو کر سکیں۔ نگاہوں کے راستے دل اور دماغ کے تمام روزنوں سے



جھانک کر دیکھ سکیں کہ انسان جو کائنات میں خدا کا نائب کہلاتا ہے نیکی کی راہ چھوڑ کر برائی کی طرف کیوں مائل ہوا؟

۱۹۲۶ء میں محکمہ اصلاح اسیران قائم ہوا۔ اور اس محکمہ پر ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ سالانہ صرف ہوتا تھا۔ ۱۹۵۵ء کے آخر میں اس محکمہ کو جیل خانے میں مدغم کرنے کی تجویز صوبائی حکومت کی کابینہ میں اکثریت پیش ہوئی۔

ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ کہاں اور کیسے صرف ہوتا تھا۔ اسکی ہلکی سی جھلک، تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں تحقیقاتی عدالت کے روبرو بیان دیتے ہوئے مولانا محمد بخش مسلم نے کہا :-

”گواہ نے تسلیم کیا کہ وہ فروری ۱۹۵۳ء تک اُسے (محمد بخش مسلم) محکمہ اصلاحات کی طرف سے پندرہ سو ترادون روپے کی رقم ملی تھی۔ اُس نے کہا (محمد بخش مسلم) یہ رقم اسے ان تقریروں کے معاوضہ کے طور پر ملی تھی جو اس نے جیل خانوں میں کی تھیں۔ یہ تقریریں قیدیوں کی اخلاقی اصلاح کے متعلق تھیں۔“

ایک اور :-

سوال: کیا جیلوں میں تقریر کرنے والوں میں امیر بخش پہلوان بھی شامل تھے؟  
جواب: جی ہاں! انہیں اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ وہ بورٹل جیل (لاہور) میں نوجوانوں قیدیوں کو حیران کن اور ابتدائی مذہبی امور کے بارے میں تعلیم دی جائے۔

سوال: کیا امیر بخش پہلوان پڑھے لکھے شخص ہیں؟  
جواب: جی نہیں!



سوال: کیا امین بخش پہلوان کو ۷ مارچ ۱۹۵۲ء سے لے کر ۲۵ مارچ ۱۹۵۳ء تک تین سو چھپن روپے دیئے گئے۔

جواب: میں صرف یہ جانتا ہوں کہ انہیں فی لیکچر پچیس روپے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ راوی روڈ سے پورٹل جیل تک آنے جاتے کا کرایہ نانہ بھی ملتا تھا۔

قیدیوں کے اصلاحی کاموں پر دوسری حکومتیں بھی روپیہ صرف کرتی ہیں لیکن قریب سے اور سلیقے سے نہ کہ ایسے طریقوں سے جس کا نتیجہ روپیہ برباد کرنے کے سوا کچھ نہ ہو اس سلسلہ میں بہاولپور ایک مثالی جیل خانہ ہے۔ جہاں کہ قیدیوں کی اصلاح پر پوری ذمہ داری سے توجہ کی جاتی ہے۔

بغداد الحدید کی اطلاع کے مطابق :-

” تقریباً ایک ہزار قیدی اس وقت گھریلو صنعتوں کی وجہ سے اپنی شاندار زندگی گزار رہے ہیں ان صنعتوں پر ان قیدیوں نے دسترس حاصل کی تھی۔“

”ریاست بہاولپور کے دارالاصلاح (جیل خانہ) میں ریاست کے قیدیوں نے ۷ فٹ لمبا اور ۲ بس فٹ چوڑا، ایک قالین تیار کیا ہے اس کے بارے میں گھریلو صنعتوں کے ڈائریکٹر نے بتایا کہ پرصغیر پاک و ہند میں اس سے بڑا قالین آج تک تیار نہیں کیا گیا اس قالین کا وزن ۲۴ من ہے اور اس پر ۲۴ قیدیوں نے سات ماہ تک کام کیا۔“

اگر ایک طرف قیدیوں سے ان کی اصلاح کے پیش نظر محنت لی جاتی ہے۔ تو دوسری طرف ان کی دل بستگی کا سامان بھی کیا جاتا ہے چنانچہ ریاست بہاولپور کے حکام نے فیصلہ کیا ہے۔



قیدیوں کو معلوماتی فلمیں دکھائی جائیں تاکہ ان کی تفریح بھی ہو سکے اور ان کو تعلیم بھی دی جاسکے تاکہ ان کا اخلاق بلند ہو اور انکی اصلاح میں اضافہ ہو۔ ان طور طریقوں کی وجہ سے بہاولپور سنٹرل جیل ایک ہی جیل ہے جو اپنے تمام تر اخراجات کی کفیل ہے۔

۱۹۴۸ء میں اس جیل کی آمدنی ۱۰۰۰۰ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ لیکن اب تین لاکھ سے بھی بڑھ کر ہے۔

ریاستی جیل خانہ کے ان صنعتی انتظامات کو سراہتے ہوئے جاپان کے سفیر متعینہ پاکستان ہر ایکسپلیشنی گومی۔ یاماگاٹا نے کہا تھا۔

جہاں تک قید لوہ کی اصلاح کا تعلق ہے اس ادارہ کا انتظام قابل تعریف ہے اور یہ ادارہ اگر ساری دنیا میں نہیں، تو کم از کم مشرق بھر میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے۔ جرمنی کے مشہور جسمانی ڈاکٹر ہنری برگ نے بہاولپور جیل کو دیکھ کر کہا :-  
"کاش یورپ کے بہت سے جیلوں میں بھی وہی ترقی یافتہ طریقے اختیار کئے جائیں جو اس جیل میں اختیار کئے گئے ہیں۔"

بہاولپور کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ریاست خیرپور نے قیدیوں کی اصلاح کا اعلان کیا :-

قیدی جیل میں اپنی روزی کی بجائے جس کا نصف قیدی کو اپنے میوی پھولوں کو بیجے کی اجازت ہوگی۔

ریاستی جیل کے قیدیوں سے بہتر سلوک اور تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کا اعلان کیا گیا ہے۔



ان اصلاحات کا مقصد یہ ہے کہ جیل سے رہا ہونے والے قیدیوں کو سوناسٹی  
کا ایک باعزت رکن بننے کے لئے تعلیم دی جائے۔

جیل خانہ میں فرصت کے لمحات اگر ضائع نہ کئے جائیں اور حکومتیں ان سے کام  
لینا چاہیں تو تاریخ عالم کی بہت سی چیزیں ہمیں سے ایجاد ہو سکتی ہیں۔ ماضی کی  
تاریخ گواہ ہے۔ کہ دنیا کے ادب کی بہت سی کتابیں انہیں لوہے کی سلاخوں کی  
اوٹ میں بیٹھ کر تربیت دی گئیں اور وہ آج ہمارے ادب کی جان سمجھی جا  
رہی ہیں۔ جن میں :-

مولانا ابوالکلام آزاد	عبار خاطر
افضل حق چوہدری (انگریزی)	پاکستان اور اچھوت
مولانا طفر علی خان	جسیات
فیض احمد فیض	دستِ صبا
حمید اختر	کال کوٹھڑی
ابراہیم جلیس	جیل کے دن جیل کی راتیں
پنڈت جواہر لعل نہرو (انگریزی)	تاریخ عالم
آسکر وارٹلے	جیل کے خطوط
جانباہ مرزا	جسیات
جانباہ مرزا	سماج کے پھوڑے

ان کے علاوہ سامانِ حرب کی اکثر چیزیں انہی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں  
میں مجوس ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ جیسے کہ :-



ٹومی گن

مسٹر کار بائین ولیم

نے اس مہلک ہتھیار کو جرمن کے جیل خانہ میں یہ حیثیت قیدی کے ایجاد کیا۔  
 غرض جیل خانہ کی چار دیواری میں ہنوز ایسے لوگوں کو اپنے پہلو میں لئے بیٹھی ہے  
 جن کے دماغ سوچ سکتے ہیں جن کے قدم برائی سے ہٹ کر نیکی کی راہ اختیار  
 کر سکتے ہیں۔ ان کی نگاہیں آج بھی ایسے قانون کی متلاشی ہیں۔ جو انہیں فسق و فجور  
 کے پھر بکراں سے نکال کر انسانیت سے ہمکنار کر سکے۔ لیکن حکومت کی سست روی  
 نے اس گوشہ سے اپنی نگاہ التفات اس طرح پھیر رکھی ہے کہ جیسے بیس ہزار انسانوں  
 کا یہ جنگل اب کسی کام کا نہیں رہا۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی ذرخیز ہے ساتھی

(۷) عقل انسانی ایک طرف چاند اور سورج کی کھوج میں آسمان تلک پہنچ چکی  
 ہے۔ دوسری طرف عیب کو اتنا خوبصورت بنر بنا دیا ہے کہ حکومتوں کے کاغذی  
 قانون دیوار پر کھڑے منہ تک رہے ہیں۔ یورپ سائنس کی دنیا میں پرورش  
 پانے والے لوگوں کا ملک ہے وہ بھی سماج کے مجرموں کے کارناموں پر داد  
 دے اٹھا ہے۔

ایک عادی چور جو تین سو کے قریب لوہے کے سیف بغیر چابی کے کھول  
 چکا تھا جب وہ پکڑا گیا۔ تو اس سے کہا گیا کہ تو بغیر چابی کے سیف کیسے  
 کھول لیتا ہے۔ چور نے یہ راز بتانے سے انکار کر دیا۔ عدالت نے اسے تین سال  
 قید کی سزا دی۔

آخر چور اور پولیس کے درمیان یہ بات طے پائی کہ اگر تو (چور) اس راز



کو اپنے تئیں محدود رکھے۔ تو ہم تو تمہیں منہ مانگی رقم دینگے۔ اس پر چور نے وعدہ کیا کہ اگر مجھے رہا کر دیا جائے، تو میں آئندہ چوری نہیں کروں گا چنانچہ اسے رہا کر دیا گیا۔ آج کل وہی چور سیف بتانے والی بہت بڑی کمپنی کے پاس ملازم ہے، امریکہ میں ایک قیدی نے رہائی کے بعد ایک کتاب تصنیف کی جس میں اس نے اپنے گزشتہ جرائم کی تفصیلات بیان کر دی اس نے لکھا میں نے سیف کیسے کھوئے لقب زنی کیسے کی۔ یہ کتاب جیب محکمہ تفتیش کے پاس پہنچی۔ تو اس نے مصنف کو بلا کر اس سے وعدہ لیا۔ کہ وہ آئندہ اس قسم کی دوسری کتاب نہیں لکھے گا۔ مصنف کی یقین دہانی پر موجودہ کتاب کی تمام جلدیں بازار سے ناپسند کر دی گئیں اور اس کے معاوضہ میں اسے بھاری رقم دی۔ جس سے مصنف اپنی باقی زندگی آرام سے بسر کر سکے۔

پرتگال کا مشہور فریب کار جو مدرس، اسپین اور پرتگال کے بنکوں سے اکثر جعلی چکیوں کے ذریعے روپیہ وصول کرتا رہا۔ فرانس اور بلجیم کے بنکوں سے بھی اسی طرح کیا۔ لیکن وہاں کی پولیس اپنی تمام پابلیکسٹوں کے باوجود اسے گرفتار نہ کر سکی آخر وہ دن آیا کہ وہ لٹریں کے ایک بنک سے گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن یہ گرفتاری ایک دوسرے شخص کے دھوکے میں ہوئی۔ اس کا اپنا جرم بھی یہاں کوئی ثابت نہیں تھا مگر پہچان لیا گیا۔ پھر اسے بیس سال قید کی سزا ہوئی۔ مگر پولیس کو یہ پتہ نہ چل سکا۔ کہ فریب کار جعلی دستخط کیسے بناتا تھا جیل میں حکام کو شک ہوا۔ کہ فریب کار جیل میں رہ کر دوسرے قیدیوں پر یہ راز افشاں نہ کر دے اسے اس شرط پر رہائی کا حکم دیا گیا کہ وہ پرتگال سے باہر چلا جائے چنانچہ فریب کار نے بیس سال قید



کے صلہ میں یہ شرط منظور کر لی۔

اسے رہائی کے ساتھ ایک کثیر رقم دی گئی۔

جہاں قانون نے اپنی شکست تسلیم کی وہاں اس نے مجرم کی حمایت کر کے اس قابل بنا دیا۔ کہ وہ آئندہ جرم کے لئے جواز تلاش نہ کر سکے۔ مگر یہ رواج ہمارے ہاں نہیں۔

مشرق ہندوستان کے جیل خاتونیں قیدی کو دوران قید ایک روپیہ چار آنے ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی۔ ۱۹۳۱ء کے بعد یہ رسم متروک قرار دے دی گئی۔ نتیجہ کے طور پر مجرم کو بہانہ ملا۔ جسے منگمری کی ایک اطلاع ہے۔

”مارج کے مہینہ میں ایک شخص کو دو سال قید کاٹنے کے بعد جیل سے رہا کیا گیا اور اسی دن چوری کے الزام میں پھر واپس جیل آ گیا۔ اس نے کہا۔ مجھے سیالکوٹ اپنے گھر پہنچنے کے لئے پسیوں کی ضرورت تھی۔ اس لئے مجبوراً چوری کرنی پڑی۔“

یہ درست ہے کہ جیل سے رہائی کے وقت ریل کالکٹ مل جاتا ہے مگر باقی نہ اوراہ کے لئے چور رقم حکام جیل دیتے ہیں۔ وہ اس قدر ناکافی ہوتی ہے کہ گھر تک مجبوراً آدمی کو بھوکا جانا پڑتا ہے۔

”۱۹۴۹ء میں وار سا۔“

پولیس نے کسی شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیا۔ لیکن ۱۹۵۴ء میں پانچ سال کے بعد جب رہا کیا گیا تو ساڑھے اٹھارہ ہزار پونڈ معاوضہ دیا گیا یہ رقم نو پونڈ، اشلنگ یومیہ کے حساب سے ادا کی گئی تھی۔ ساتھ ہی پانچ سو تیس پونڈ کی رقم تفریح اولہ



علاج کے لئے دی گئی تاکہ ۱۹۴۰ء نوں کی قید کی تھکان دور کر سکے۔  
حکومت پولینڈ کو مسٹر ہرین فیلڈ سے معذرت کرنی پڑی۔ کہ اسے غلط فہمی  
کی بنا پر قید کیا گیا تھا۔

مگر ہمارے ہاں راہ چلتے مسافروں کو ۱۰۹ ایس گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا  
جاتا ہے جہینوں تک اس کی عدالت میں پیشی نہیں ہوتی مگر جیب پیش کیا جاتا  
ہے۔ تو وہ سزا سے کہیں زیادہ حوالات بھگت چکا ہوتا ہے۔  
اور ایسے لوگ پھر جیل خانوں میں عادی مجرموں سے مل کر اپنے تعلقات استوار  
کرتے ہیں۔ اور جیب وہ جیل سے باہر آتے ہیں۔ تو اچھے خاصے مجرم کی سی عادات  
ان میں موجود ہوتی ہیں۔

(۱۸) جیل خانہ کے بگڑے ہوئے ماحول پر جس قدر کہا سنا جائے کم ہے اس  
بگاڑ کا سنوار حکومت کے بس کا روگ ہے۔ صرف حکومت کے بس کا۔  
جیل خانوں کی اصلاح کے لئے جو اقدام پیشہ ازیں اٹھائے گئے اور جو کچھ  
اس پر لکھا جا چکا ہے۔ وہ اس قدر ناکافی ہے کہ بقول ایک مجرم کے۔  
” اگرچہ جیل میں قیدیوں سے اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ اور انہیں کوئی نہ کوئی  
کام بھی سکھایا جاتا ہے مگر ایسا کوئی کام نہیں جس کے سہارے کوئی قیدی آزاد  
ہو کر بغیر سڑائے کے اپنی زندگی گزار سکے۔

مذم نے بتایا کہ جیل سے آنے کے بعد عوام کی نگاہوں میں ایک قیدی ذلیل  
ترین انسان سمجھا جاتا ہے اس احساس کے پیش نظر ایک سزا یافتہ شخص کا زندہ  
رہنا۔ تب ہی آسان ہو سکتا ہے۔ کہ اگر کوئی جماعت یا حکومت جیل سے رہا



ہونے والے کی مناسب نگہداشت کرے ورنہ ایک دفعہ کانسٹریبانہ ہمیشہ سزا  
بھگتا رہتا ہے

یہ بیان محمد امین عرف منانے ان دنوں دیا۔ جب وہ دو سال قید کاٹنے  
کے بعد رہا ہوا۔ اور دوسرے دن چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

ہمارے ملک کے بگڑے ہوئے اقتصادی حالات بھی بہت حد تک جرائم کو  
آگے بڑھانے میں ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ جیسے جیسے ملک میں بیکاری بڑھے  
گی جرائم میں اضافہ اور جلی خالوں میں قیدیوں کی گنتی بڑھتی جائے گی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد لندن میں بیکاری کے ساتھ جرائم بڑھے اور اس  
حد تک بڑھے کہ ایک کروڑ آبادی کا یہ شہر چوروں اور ڈاکوؤں کا مرکز معلوم  
ہونے لگا۔ آخر حالات درست ہوئے تو جون ۱۹۵۵ء میں وہاں کے پولیس کمشنر  
کو بیان دینا پڑا۔

”لندن میں ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کی نسبت جرائم میں کمی ہو رہی ہے۔ ملک میں  
بیکاری کا خاتمہ اور تجارت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے ملک خوشحال ہو گیا ہے۔  
مکن ہے ہماری اخلاقی حالت بھی کسی حد تک درست ہو گئی ہو۔ جو جنگ کے بعد  
بالکل تباہ ہو گئی تھی۔“

آج مغربی پاکستان کے جلی خالوں میں بیکاری کا غالب حصہ چوروں اور  
قاتلوں پر مشتمل ہے راہ زنی کی وارداتیں تو آئے دن کا مذاق بن کے رہ گئی ہیں۔  
”ہمارے ملک میں جنسی جرائم بڑھتے جا رہے ہیں قتل کی واردات میں روز  
پر روز اضافہ ہو رہا ہے کسی دن بھی کوئی اخبار اٹھا کر دیکھے جس میں اس طرح کی



خبریں کثرت سے نظر آئیں گی۔

پنجاب کا کوئی ضلع ایسا نہیں جہاں قتل و غارتگری کا بازار گرم نہ ہو گجرات کا ضلع تو تمام ضلعوں پر صلت لے گیا ہے۔

اس کا واحد حل اول یہ ہے کہ ملک کے اقتصادی حالات کو درست کرنے کے لئے گھریلو اور دیگر صنعتوں کو جیل خانوں میں رواج دیا جائے اور دوسرے قیدیوں پر اعتماد بڑھایا جائے۔

۱۹۵۵ء کے آخر میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے جس قدر نقصان ہوا۔ اگر قیدیوں پر بھروسہ کر کے انہیں باہر نہ لایا جاتا تو آج سیلاب کے کھنڈرات اپنے نقوش چھوٹنے کو اتنی جلدی آمادہ نہ ہوتے۔ یہ بھروسہ جس قدر بڑھے گا۔ جرائم میں کمی ہوگی۔ غیر مالک میں اپنے قیدیوں پر اس قدر بھروسہ کیا ہے۔

اٹلی کے جیل خانے سے ایک سنیس ۳۷ سالہ قیدی کو اس کی درخواست پر کہ مجھے شادی کرنے کے لئے چند روز باہر جانے کی اجازت دی جائے چنانچہ اسے رخصت دے دی گئی اور وہ مقررہ وعدے پر شادی کے بعد جیل واپس آ گیا۔

اس قسم کے واقعات سیلاب کے دلوں ہمارے ہاں بھی سوئے کچھ قیدی عملاً سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے۔ لیکن وہ پھر سے جیل آگئے اگر اسی طرح اعتماد بڑھتا گیا اور دونوں فریق ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو ہماری بہت سی مشکلات کا حل نکل آئے گا۔

تجاویز :-

میری زندگی کے بہت سے سن و سال جیل خانوں میں گزرے ہیں۔ متحدہ



پنجاب کا کوئی جیل خانہ ایسا نہیں جہاں کے درو دیوار مجھ سے آشنا نہ ہوں سب کے سب میری گستاخ نگاہیں پر ماتم گناہ ہیں۔ خزاں و بہار کے۔ بیسیوں لیل و نہار ان لوچھی دیواروں کی اوٹ میں بسر کر دیئے۔ لوہے کی مضبوط سلاخوں کے پیچھے نسیم سحری کے نغمے بھی سنے اور بادِ سموم کی تلخ گامیوں سے اپنے کو مجروح بھی کیا۔ اس زمین کا ہر ذرہ میری آبلہ پائی پر گواہ ہے کئی برس گزرنے پر بھی میرے گیتوں کی آواز جیلوں کے درو دیوار سے سنی جاسکتی ہے۔ میں ان راستوں کو مدت سے روند چکا ہوں۔ ان کے ہر موڑ سے واقفیت رکھتا ہوں۔ میرے بچنے سے ثیاب تک کا زمانہ اسی دشت کی سیاحتی میں گزرا ہے بدیں و جہ میری تجاویز کا مہصل مشاہرت پہلے کشنید پر نہیں۔ اگر حکومت جیل خانہ کی اصلاحات کے سلسلہ میں کوئی اقدام کرنا چاہتے تو میری تجاویز پر عمل پیرا ہو تو تھوڑی مدت کے بعد حالات بالکل دوسرے رنگ میں سامنے آئیں گے۔

(۱) جیل خانے کا نام بدل کر دارالاصلاح رکھ دیا جائے۔

(۲) اس نام میں اس قدر دہشت پنہاں ہے کہ نفسیاتی طور پر آدمی کا ذہن اس نام سے بدل ہو جاتا ہے۔

(۳) اس نام کے ساتھ ظلم و جور کی تاریخ وابستہ ہے جس سے آدمی کا ذہن کسی طور فاسخ نہیں ہو سکتا مذکورہ بالا نام کی بنا پر نام کی تبدیلی ضروری ہے۔

(۴) جیل حکام بااخلاق اور تجربہ دار ہونے چاہیں۔

(۵) جیل خالوں میں غالب اکثریت ناخواندہ لوگوں کی ہوتی ہے لہذا آفیسر

ایسے ہونے چاہیں جو اخلاق اور تجربہ کی بنا پر قیدیوں پر قابو پاسکیں۔



(ب) جس طرح دوسری سرکاری ملازمت کے لئے حکومت نے کورس مقرر کر رکھا ہے۔ جیل کی ملازمت کیلئے بھی کورس مقرر ہونا چاہئے۔

(ج) جیل لائن کا ہر طالب علم خواہ وہ کسی حصے سے متعلق ہو دن کا کچھ وقت قیدیوں کے ساتھ گزارے تاکہ قیدیوں پر ہونے والا آفیسر قیدیوں کی نفسیات کا ماہر ہو سکے۔

(۳) ہر وارڈر کی تنخواہ اتنی اور نوے کے درمیان ہونی چاہئے نیز وارڈروں کے بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر ہونی چاہئے۔

(۱) جیل خانے کے انتظام کا بہت حد تک دار و مدار وارڈروں پر ہے اگر وہ خوشحال نہیں تو جیل کا نظام اور بھی خراب ہو گا جیسا کہ ہے۔

(ب) وہ تنخواہ کی کمی کے باعث ہر بد معاشی میں قیدی کا معاون ہوتا ہے کیونکہ ان حرکات سے اسے مالی فائدہ پہنچتا ہے۔

(ج) ہر وارڈر سے چھ گھنٹے سے زائد نوکری نہ لی جائے جب کہ آج کل ہر وارڈر آٹھ گھنٹے نوکری دیتا ہے۔ کوٹ موقوعہ، گھڑی گشت، پترا وغیرہ کا سفر ملا کر قریباً سات میل روزانہ مسافت طے کرنا پڑتی ہے اس بنا پر اگر وارڈروں کی صحت دیکھی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دن کا چلتا پھرتا ہسپتال ہے اگر نوکری چھ گھنٹے ہو تو وارڈر اپنی صحت اور گھر بار کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔

(۴) زنانہ جیل کی محافظ (عورت) دایہ ہونی چاہئے ؟

(۱) سوائے لاہور کے پنجاب بھر میں کہیں زنانہ جیل کا الگ انتظام نہیں ہو سکتا اور سب جیلوں میں مجرم عورت کے لئے علیحدہ چار دیواری کر دی جاتی ہے اسکا انتظام



ایک ملازمہ کے سوا باقی تمام مرد قیدیوں یا وارڈروں کے سپرد ہوتا ہے اس کا بوجھ نکتا ہے وہ لکھنے سے نہیں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

(ب) ہر زنانہ جیل کا اندرونی اور بیرونی انتظام عورت ملازمہ کے سپرد ہونا چاہئے جہاں تک کہ ڈاکٹر بھی عورت ہی ہو۔

(ج) بسا اوقات کوئی حاملہ عورت مجرم کی حیثیت سے جیل لائی جائے اور جب بچے کی پیدائش کا وقت آتا ہے تو مرد ڈاکٹروں کو ساری منتریں طے کرنی پڑتی ہیں۔

(د) عام طور پر زنانہ جیل خانوں میں مجرم عورت کو اگر کوئی جسمانی تکلیف ہو تو جیل کا ڈاکٹر ہی علاج کرتا ہے۔ حالانکہ عورت کی بعض امراض ایسے ہوتے ہیں جن کا علاج لیڈی ڈاکٹر ہی کر سکتی ہے لہذا ان تمام چیزوں کا واحد حل یہی ہے کہ ڈسٹرکٹ اور سب جیلوں کے زنانہ وارڈروں کی محافظ ایسی عورت ہونی چاہئے جو دایہ کے کام کو سمجھتی ہو۔

(۵) ہر جیل کے کارخانے میں مندرجہ ذیل صنعتی کام ہونے چاہئے :-

درزی۔ لوہارا۔ بڑھٹی۔ پینٹر۔ موچی۔ چمڑے کی رنگائی۔ کپڑا بننے کی کھڈی۔

لوٹ بنانا۔ جلد سازی۔ پرلین۔ درسی اور قالین بنانا۔ رنگائی (گرم اور سوتلی)

صابن سازی۔ سوتر کے بٹن بنانا۔ ٹین گری یا ٹین سازی۔ کرسی بنانا وغیرہ

(۶) پیشتر اسی پنجاب کی جیلوں میں لاہور بوسٹل جیل ہی ایک ایسا

ادارہ ہے جہاں قدرے صنعت کاری کا رواج تھا۔ لاہور سنٹرل اور منگھری جیل میں

پرلین اور قالین بنائے جاتے تھے باقی سب میں کوہو۔ خراس۔ موج کٹائی۔

بان بنانا۔ جگائی۔ کاغذ بنانا اور گھوٹنا وغیرہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کام صنعت



کے طور پر پیش نہیں کیے جاسکتے اور نہ ہی ان کاموں سے قیدی کا مستقل روشن ہو سکتا ہے۔ جب کسی کھاتہ سے قیدی رہا ہو تو اس کے پاس متعلقہ آفیسر کا سرٹیفکیٹ ہوتا کہ جیل سے باہر آکر اسے کام تلاش کرنے میں وقت نہ ہو۔

(ب) اگر حکومت ایسے لوگوں کو اپنے صنعتی اداروں میں جگہ دے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کی نگرانی ہو سکے گی ورنہ ہو سکتا ہے کام نہ ملنے کی وجہ سے وہ پھر ٹھوکر کھا جائیں۔

(۶) ہر قیدی کی تنخواہ مقرر ہونی چاہئے اس سے حکومت اور قیدی دونوں کا فائدہ ہے۔

(۷) ایک آدمی جیل میں آتا ہے اور پڑھا لکھا ہے لیکن۔  
تو اس کی تعلیم اور قید کے مطابق کام سکھانا چاہئے جب وہ کامیاب ہو جائے تو اس کی تنخواہ مقرر کرنی چاہئے۔

(ب) تنخواہ کے تین حصے ہونے چاہئے ایک حصہ قیدی کی خوراک پر خرچ ہو دوسرا اس کے حساب میں جمع ہو۔ تیسرا اس کا اپنے مصرف میں لائے۔

(ج) اس سے ایک تو حکومت کے بجٹ میں تخفیف ہوگی اور دوسرا قیدی کو رہا ہوتے وقت معقول رقم مل جائے گی جس سے وہ اپنا کام چلا سکے گا۔

(۷) قیدیوں کے کھانے میں گھی استعمال ہونا چاہئے نیز بیف (BEEF) کی جگہ بکے کا گوشت ملنا چاہئے۔

(۸) بعض طبائع کے لئے سرسوں کا تیل مفید نہیں ہوتا اور مسلسل تیل کا استعمال کس کے لئے بھی بہتر نہیں۔ موجودہ وقت میں جو تیل جیل میں قیدیوں کی خوراک



میں استعمال کیا جاتا ہے اس پر سرسوں کے تیل کی کوئی ضمانت نہیں۔  
 (ب) بیف (BEEF) (گائے کا گوشت) طبی نقطہ نظر سے یہ گوشت کس  
 صورت میں مفید نہیں۔

جدید اور قدیم اطباء کی رائے ہے کہ گائے کا گوشت جگر میدہ اور آنتوں کے لئے  
 قطعاً غیر مفید ہے نیز اس کے گوشت میں دق کے جراثیم اکثر پائے جاتے ہیں اس صورت  
 میں گائے کا گوشت آدمی کی صحت کے لئے مفید ہو سکتا ہے یہ رائے صرف ایسے  
 جانوروں کے گوشت کے متعلق ہے جو جوان ہوں۔ لیکن جیلوں میں جو گوشت  
 قیدیوں کو دیا جاتا ہے وہ شاید ایسے جانوروں کا ہوتا ہے جو فرشتہ موت کے  
 ہاتھوں بھاگ گئے ہوں۔

(ج) اگر تجویز ۶ ماں لی جائے تو جیل کی خوراک خود بخود اچھی ہو سکتی ہے  
 بشرطیکہ تجویز ۲ قابل قبول ہو۔

(د) موجودہ حالات میں ہفتہ میں دو مرتبہ گھی استعمال کیا جاتا ہے ایک دن  
 سالن میں ایک دن چاولوں میں۔ لیکن اس کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے  
 مثلاً سولہ سیر چاول کی دیگ میں ایک سیر یا تین پاؤ گھی تیس سیر گوشت کے  
 شوربے میں پانچ سیر گھی۔ اگر اسی مقدار میں روزانہ قیدیوں کی خوراک میں گھی استعمال  
 ہو تو تیل کے مسلسل استعمال سے بہتر ہے۔

(۸) ہر جرم کے لئے جیل الگ ہو (چور، ڈاکو، گرہ کٹ، قاتل) اور دیوانی اور  
 فوجداری اکٹھی ہوں۔

(۹) اس وقت پنجاب میں سنٹرل اور ڈسٹرکٹ جیلوں کی تعداد بیس کے



قریب ہے۔ اگر ان سب کو ڈویژن وار تقسیم کر کے مختلف جرائم کے لوگوں پر مخصوص کر دی جائیں۔ تو ایسے قماش کے لوگوں کو سمجھانے بھجانے میں سہولت ہوگی۔  
(ب) عادی مجرموں کے لئے منگمری جیل پیشتر سے ہے لیکن موجودہ ماحول میں کافی نہیں کہا جاسکتا۔

(ج) نو آؤ گناہ گاروں کو پیشہ ور مجرموں سے فوراً الگ کر لینا چاہئے تاکہ سفید چادر پر جو داغ پڑ چکا ہے اس میں مزید اضافہ نہ ہو اور نہ ایک دن آئے گا۔ جب ساری چادر داغ دار ہو جائے گی پھر اس کا دھونا مشکل ہوگا۔  
(د) ایسے قابل ترین لوگوں کی خدمت حاصل کرنی چاہیں جو مجرم سے گفتگو کرتے وقت مجرم اور مجرموں کو سمجھتے ہوں اور وہ نفسیات کے ماہروں جرم کا تعلق دل کی گہرائی سے ہوتا ہے جب تک اس آتھاہ گہرائی میں غوطہ زن ہونے والے تلامش نہیں کیا جائے گا جرم کی اصل معلوم ہونا مشکل ہے۔ علاج مرض کی تشخیص کے بعد ہوتا ہے۔

(۹) نابالغ بچوں کے لئے جیل الگ ہو۔

(۱۰) تقسیم ملک سے پہلے وہاں میں ریفارمیٹری (reformatory) نوع مجرموں کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں پڑھائی و دستکاری کے تمام شعبے سیر و تفریح کا دستکاری صحت کے لئے کھیل کود وغیرہ کا انتظام اتنا باقاعدگی سے تھا کہ بچے یہاں سے فارغ ہو کر بہت کم جرم کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اگر ایسا انتظام بھی پاکستان میں ہو جائے تو ہماری آئندہ نسلیں جرم کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے نیک اور بہتر ہو سکتی ہیں۔



(۱۰) ہر جیل میں قیدیوں کے لئے تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہو۔

(ا) گوجیلوں کے گزشتہ اور موجودہ انتظام میں تعلیم کا بھی حصہ ہے۔ مگر سوجہ طرہ تعلیم اس قدر ناقص اور غیر مفید ہے کہ مدتوں بعد قیدی کو الف، ب کی شناخت ہوتی ہے۔ دن پھر کی مشقت سے تھکے ہارے قیدی کو رات کے وقت اس کی سیرک میں اسی کا ایک ساتھ پڑھانا شروع کرے تو بتاؤ وہ خاک پڑھے گا جب کہ اسے یہ فکر بھی ہو کہ صبح بھر مشقت پہ جانا ہے۔

(ب) ہمارے ملک میں جرائم کی بڑی وجہ ہمارے عوام کے ناخواندگی ہے جیلوں کے اندر کا عوام بھی اسی قطار میں کھڑا ہے ہم صرف جیلوں کے طریقہ تعلیم کو ہی تبدیل نہ کریں بلکہ جیل خاتوں کے لئے الگ نصاب تعلیم لکھوائیں۔

تجویر ۸ اور ۹ کے مطابق ہر جیل میں وہاں کے ماحول کے پیش نظر کتابیں پڑھائی جائیں اور دن کا ایک حصہ تعلیم کے لئے مخصوص کیا جائے یہ طریقہ بالغان کا ہے۔ اس کے لئے قیدی نہیں بلکہ باہر سے قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں۔

(ج) لاہور بوسٹل جیل کی طرح تعلیم کے لئے اوقات اور جگہ کا تعین ضروری ہے جیل میں امتحان سال میں دو مرتبہ ہونے چاہیں۔ جیل کے نصاب تعلیم میں صرف مذہب اور اخلاقی کہانیاں لکھی جائیں۔

(د) ہر جیل میں لائبریری کے موجودہ نظام کو بالکل بدل دینا چاہئے۔ اور بہترین کتب کے علاوہ روزانہ اخبارات اور بہترین ادبی رسائل کا انتظام کیا جائے تاکہ جیل خانے کا ہر قیدی ملکی معاملات سے باخبر رہے۔



(۱۱) پنجاب کی اکثر جیلیں پھر سے تعمیر کرتی جا رہی ہیں

۱۔ یوں تو پنجاب کے تمام جیل خانوں کا ڈھانچہ بدلنے کی ضرورت ہے لیکن بعض جیلوں کے اندرونی حصے کو از سر نو تعمیر کرنے کی خاص طور پر ضرورت ہے ان عمارت کو تعمیر ہوئے سال ہا سال گزر چکے ہیں ان کا اندرونی ڈھانچہ اس قدر خستہ اور ویران ہو چکا ہے کہ برسات کے دنوں تھپتھپ سکتی ہیں موسم گرما میں سورج کی تپش سے قیدی اپنے آپ کو محفوظ بھی نہیں رکھ سکتا۔

(ب) حق تو یہ ہے کہ تمام جیلوں کو پھر سے تعمیر کیا جائے اگر یہ نہیں تو کوٹ مرقوم بجائے کچی اینٹوں کے پکی اینٹوں سے بنایا جائے اس سے وارڈروں اور بندراؤں کو فائدہ ہوگا۔

بجائے پتڑا چلنے اور تمام دن بندراؤں اور وارڈروں کے سفر کے جیل خانوں کے چاروں کولون پر برج بنا دیئے جائیں جن پر بندر یا وارڈروں کے اپنے وقت پر لوکری دیں اس سے جیل کے انتظام میں بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ جیل خانہ جات کی دیواریں اسی قدر خستہ ہو چکی ہیں کہ بار بار لیا پوتی کے گذشتہ سیلاب میں ملتان اولڈ سنٹرل جیل کی دیواریں گر گئیں یہی حال پنجاب کی دوسری جیلوں کا ہے۔

(ج) نیو سنٹرل جیل ملتان ڈسٹرکٹ جیل گجرات اور نیو پوسٹل لاہور یہ تین جیلیں نئے طریقے اور نئے ماڈل پر تعمیر کی گئیں ہیں۔ کیا ان کے جیل ہونے میں کوئی فرق آیا؟ لیکن ہر سہ عمارت میں رہنے سے قیدی کو کسی موسم میں کوئی دقت نہیں ہوتی ایک اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ گرمی کے دنوں اینٹیں زیادہ



گرم ہو جاتی اور اس طرح قیدی کے لئے موسم گرما زیادہ مشکل ہو گا مگر کچی اینٹیں کو نسبی رعایت کرنی ہے، یہ محض بہانہ ہو گا۔

(۱۲) جیلوں سے تنہائی کو ٹھریوں کا طریقہ ختم کر دیا جائے۔

۱۔ اگر تجویز نمبر قبول کر لی جائے تو نئی تعمیر میں تنہائی کو ٹھری کا سسٹم ختم کر دیا جائے اس سے دو طرح کا نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔

اول ہوا کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے جون جولائی کے موسم میں تنہائی کو ٹھری دن اور رات دونوں وقتوں میں کسی وقت بھی بند ہونے سے دل اور جگر پر اثر ہوتا ہے۔ بیوادی قیدی اس اثر کو ماندہ زندگی تک زائل نہیں کر سکتا۔

دوم، جیلوں میں کبھی آپ کو آنے کا موقع ملے تو سیاہ رنگ، پھکی ہوئی کالیں اندر دھنسی ہوئی آٹلیں، مردہ سا جسم والے قیدی دکھائی دیں گے یہ دراصل اسی مرض کے مریض ہیں۔ گرمی کے دنوں میں شاہ سجے تارے پھانے میں صلح پانچ بجے کھلتے ہیں بارہ گھنٹے مسلسل جس قیدی کو گرمی کے دنوں تنہائی کو ٹھریوں میں بند رہنا پڑے تو اندازہ کریں اس کا پانی کیا ہے گا؟

بعض لوگ تنہائی میں خوف محسوس کرتے ہیں اور یہی خوف بڑھتے بڑھتے اختلاج قلب کی شکل اختیار کر لیتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ تنہائی کو ٹھری کے سسٹم کو ختم کر دیا جائے۔

(۱۳) جیلوں میں مسیتوں کا انتظام باقاعدہ اور بہتر ہونا چاہئے۔

۱ : سکھ اور دکھ انسانی زندگی کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں جس طرح

رات اور دن ایک دوسرے سے معلق ہیں انسان کسی حالت میں بھی ہو یہ کبھی



جد نہیں ہو سکتے۔

یوں تو جیلوں میں ہسپتال کا انتظام ہے مگر یہ شکایت پرانی ہو چکی ہے کہ یہاں کے انتظامات جیل کے باقی انتظامات کی طرح نہایت ناقص ہوتے ہیں۔ اول تو سول سرجن ہفتہ میں زیادہ سے زیادہ دو دن معائنے کے لئے آتے ہیں اور مریض کو سرسری نظر دیکھنے کے علاوہ ان کی شاید کوئی ڈیوٹی ہی نہیں جس ڈاکٹر نے تے ہر وقت بیمار قیدلوں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے وہ بہت حد تک اپنا کام کمپوٹر کے سپرد کرتا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ قیدی سول سرجن اور ڈاکٹر کی بے اعتنائی کے باعث مستقل مریض بن جاتا ہے۔

(ب) رات کو اگر کوئی قیدی کوٹھڑی میں بچھا ہو۔ تو اس کی اطلاع احاطے کے نمبردار کو دینی پڑتی ہے۔ نمبردار پھر چکر کے نمبردار کو اطلاع کرتا ہے چکر کا نمبردار پھر ڈیوٹی کے وارڈ کو اطلاع دیتا ہے۔ وارڈ پھر ڈیوٹی کے دھیان کو اطلاع کرتا ہے۔ دھیان پھر کسی آنے والے کا اشرار کرنا ہے تاکہ ڈاکٹر کے گھر اطلاع کی جائے ڈاکٹر صاحب پھر کمپوٹر کو اطلاع کرتے ہیں۔ پھر کمپوٹر صاحب کا آنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

”کون جتنا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک“

لہذا ضروری ہے کہ ایک ذمہ دار آدمی ہر وقت ہسپتال میں رہے تاکہ وقت پر بیمار قیدی کو طبی امداد پہنچ سکے۔

(ج) دوائیاں اب تو قدرے پہلے سے بہتر آچکی ہیں مگر اب بھی ایک نمبریت سے مریضوں کے مرض کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگر ذرا بہتر انتظام



سے جیل کے ہسپتال کو چلایا جائے۔ اور افسران متعلقہ اپنی ذمہ داری کا احساس کریں۔ تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

(۱۴) مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے قیدیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کی عام اجازت ہونی چاہئے۔

۱۵ : انگریزی عہد میں چونکہ مختلف مذاہب کے لوگ جیلوں میں ہونے کے باعث یہ بہانہ کیا جاسکتا تھا کہ قیدیوں کا اجتماع جیل خانے کے انتظام کے لئے خطرے کا باعث ہے لیکن اب تو یہ حجت بھی تمام ہو چکی ہے۔

سب کے سب مسلمان ہیں۔ لہذا جمعہ، عیدیں، بارہ ربیع الاول جیسے مذہبی تہواروں پر تمام قیدیوں کو ایک جگہ جمع ہو کر فریضہ کی ادائیگی کیلئے موقوفہ دینا چاہئے۔

❖ ~~~~~ ❖

ختم



